قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۶۲۱۹

مجلسِ ادارت

مدیر مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: سید عبدالسلیم

مطبع: آفتاب عالم پریس

۱۳، ہسپتال روڈ، لاہور

فون ۲۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۶ ——— جولائی ۱۹۹۳ء ——— شمارہ ۷

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

تعارف	ادارہ	۲
لمعات	ادارہ	۳
تعزیت	ادارہ	۹
بیادِ علامہ غلام احمد پرویزؒ	بشیر احمد عابد	۱۰
روحانی ملوکیت	عاطف طفیل	۱۹
میں آج کیوں ذلیل	ڈاکٹر صلاح الدین اکبر	۲۶
دستک	ثریا عندلیب	۳۲
جاگو ہوا سویرا	ساجد محمود	۳۷
حسنِ اثر	حنیف وجدانی	۴۱
حقائق و عبر	ادارہ	۴۲
طلوعِ اسلام	ادارہ	۴۵
ربوبیتِ عامہ	سید حیات نبی رضوی	۴۶
بچوں کے صفحات	ادارہ	۵۴
اشتہاراتِ درس		۵۷
کہتی ہے خلقِ خدا غائبانہ کیا		۶۰
بوسنیا سے سبق سیکھئے	شاکر رضوانی	۶۴
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْل	بریگیڈیئر اعواز الدین	۶۸
اسقاطِ حمل	ڈاکٹر سید عبدالودود	۸۰

علامہ

غلام احمد پرویزؒ

تاریخ پیدائش ۹ جولائی ۱۹۰۳ء	تاریخِ وفات ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء

"میں قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں۔ میری زندگی بچپن سے لے کر اس وقت تک اس کتابِ عظیم کے ساتھ متمسک رہی ہے۔ ابتداءً میں نے بھی (جیسا کہ ہمارے ہاں کا معمول ہے) اس کا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا، لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر تنقیدی نظر ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

یہ میرے بخت کی یاوری تھی کہ عین اس وقت جب میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا، علامہ اقبالؒ کی بصیرت قرآنی سے (من جملہ دیگر امور) یہ اہم نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ قرآنِ کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رُو سے سمجھنا چاہیئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے۔" ("لغات القرآن" از علامہ غلام احمد پرویز")

(ایڈیشن دوسرا ۱۹۸۴ء باب پیش لفظ صفحہ ۱۹)

○

"میرے نزدیک دین میں سند اور حجت، خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) ہے۔ جو کچھ اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے میں اُسے قرآنی معیار پر پرکھتا ہوں۔ جسے اپنی بصیرت کے مطابق پاتا ہوں، اسے صحیح قرار دیتا ہوں۔ جو اس کے خلاف نظر آئے اسے غلط سمجھتا ہوں۔ مجھے کسی کی دلآزاری مقصود نہیں، لیکن اگر کوئی اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ اس کے کسی ایسے عقیدہ یا نظریہ کو، جسے میں قرآن کے خلاف پاتا ہوں، غلط کیوں ٹھہرایا جاتا ہے، تو اس کے لئے میں معذور ہوں ـــ قرآن کی رُو سے کتمانِ حقیقت جرمِ عظیم ہے اور منافقت، انتہائی دنایت۔"

(شاہکارِ رسالت از علامہ غلام احمد پرویزؒ، ایڈیشن 1991ء۔
باب گذرگاہِ خیال، صفحہ ۸۸)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ہم نے گذشتہ چند اداریے قیام پاکستان کے بعد اس المیے کے حوالے سے لکھے کہ یہاں اسلامی معاشرہ کیوں قائم نہ ہوسکا — یہاں اسلام بطور ایک دین کیوں نافذ نہ ہوسکا، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم افراد کی ایسی تعلیم و تربیت سے غافل ہوگئے جس سے اسلامی اقدار ان کی سوچوں اور ان کے اعمال میں اس طرح جاری و ساری ہوجاتیں، جیسے جسم میں خون گردش کرتا ہے، — ہم نوجوان نسل میں وہ کردار پیدا کرنے میں ناکام رہے جو ان کی خودی کو مستحکم اور ان کی ضرب کو کاری بنا دیتا۔ پرانی نسل لوٹ کھسوٹ میں اس قدر مگن ہوگئی کہ نئی نسل کو مستقبل کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنا ہی بھول گئی۔ وہ بھول گئے کہ نوجوان نسل ہی قوموں کی بگڑی بناتی ہے — انہی کا جوشِ عمل تاریخ کے دھارے کا رُخ بدلتا ہے۔ اگر ہم نئی نسل کو اس نہج پہ تیار کرتے کہ مکافاتِ عمل کا نقش ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوجاتا تو ان کا کوئی قدم تخریب کی سمت نہ اُٹھتا — یاد رہے کہ اسلام ایک انقلابی تحریک کا نام ہے، جو پہلے ذہنوں میں انقلاب برپا کرتی ہے اور پھر مشہود طور پر معاشرے کی تبدیلیوں کا مظہر بنتی ہے،

پچھلے شمارے میں ہم نے اداریے کے فوری بعد اپنے ایک کرم فرما مخدوم زادہ صاحب کا ایک خط شائع کیا تھا جس کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا، پاکستان میں تمام پریشانیوں کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے فرمودات کو فراموش کردیا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ دیا ہے — دونوں باتیں یقیناً سچ ہیں — دو باتیں بتائیے — کیوں چھوڑا؟ اور اب ان کی طرف کیسے واپس جا سکتے ہیں؟

سوالات نہایت مختصر ہیں۔

کیوں چھوڑا؟

کیسے واپس جا سکتے ہیں؟

سوال جتنے مختصر ہیں، جواب اتنے ہی تفصیل طلب ہیں،

"کیوں" کے لئے ہمیں صدیوں پرانی تاریخ کو کھنگالنا پڑے گا اور "کیسے" کے لئے کہنے کو تو ہم بھی کہہ چکے ہیں کہ "قوانینِ خداوندی" پر عمل کر کے فرقوں سے پاک ایک امت کی تشکیل کیجئے اور تسخیرِ کائنات کے سفر پر چل نکلئے، انتم الاعلون کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گا ــــ"

مگر ہمیں خود تسلیم ہے کہ یہ OVER - SIMPLIFICATION ہے، بات اتنی سادہ اور آسان نہیں! فرقے صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی بنیادیں بہت گہری اور مشاجرت کے اس درخت کی جڑیں افرادِ امت کے دلوں میں بہت مضبوطی سے پیوست ہیں۔ لوگ عقیدوں پہ غور کرنے کی بجائے ان کے تحفظ کے لئے جان دینے کو تیار ہو جائیں گے، یہ ان کے ایمان کا جزو بن چکے ہیں۔ ان کو بڑے بڑے آئمہ کرام کی سندات کا تقدس تو حاصل تھا ہی اب آئین میں بھی تحفظ حاصل ہو چکا ہے ــــ نتیجہ یہ کہ ہمارے دلوں میں مہر و محبت کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف دشمنی جاگزیں ہے۔ ذلت، خواری اور پسماندگی ہمارا مقدر بن چکی ہے ــــ مگر ہم سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں حالانکہ "تتفکرو" کا حکم ہمارے ہی لئے تھا۔

آج پاکستان ہی نہیں، ساری کی ساری امتِ مسلمہ کا یہی حال ہے۔ مسلمان دنیا بھر میں پسماندہ، دوسروں کے دستِ نگر، کمزور و ذلیل ہیں ــــ

آیئے دیکھیں، جسے ہم "امہ" یا "امتِ مسلمہ" کہتے ہیں اس کا کہیں وجود بھی ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک ارب سے زیادہ وابستگانِ اسلام کے وجود سے انکار کیسے ممکن ہے، وہ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور لاکھوں فرزندانِ توحید حج کے موقعہ پر دنیا کے گوشے گوشے سے لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے طوافِ کعبہ کے لئے چلے آتے ہیں، اس سب کے ہوتے ہوتے "امت" کے وجود سے انکار کیسے ممکن ہے؟

ہم مانتے ہیں کہ مراکش سے انڈونیشیا تک ایک سمندر ہے ان لوگوں کا جو خود کو مسلمان کہتے ہیں، ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم انہیں کوئی اور نام دیں۔ لیکن اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بھی ہمارا ہی فرض ہے کہ کیا وہ اس معیار پہ پورے اترتے ہیں کہ انہیں ایک "امت" کہا جائے، علامہ اقبالؒ نے ایک کسوٹی دی تھی جب انہوں نے کہا تھا،

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

کیا انسانوں کے اس بحرِ ذخار میں یک نگہی کی کوئی ایک مثال بھی نظر آتی ہے،

صورت حال اس وقت یہ ہے کہ مراکش الگ تھلگ ہے، الجزائر خود میں اُلجھا ہوا ہے، لیبیا اپنی سوچ کے لحاظ سے ایک الگ جزیرہ ہے، ایسا ہی ایک جزیرہ انقلابی ایران ہے، مصر کی اپنی سوچ ہے جو سوڈان کی حریف اور اسرائیل کی حلیف ہے، شام گومگو کی کیفیت میں ہے، شرقِ اردن کسی گنتی شمار ہی میں نہیں، امارات اور سعودی عرب ہیں جو اپنی بے حساب دولت سے ایران کے خلاف جنگ میں عراق کی مدد کرتے رہے مگر پھر انہی لوگوں نے اپنی مقدس سرزمین عراق پر تاریخ کی سب سے شدید بمباری کا موقع فراہم کیا، عراق ہے جو کل تک پہلے ایران سے برسرِ پیکار رہا، لاکھوں عراقی قتل کروائے، لاکھوں ایرانی مارے، یہ سب کلمہ گو تھے، دونوں پارٹیاں اپنے مقتولوں کو شہید کہنے پہ مصر ہیں ــــ اب ہمیں اس لفظ پہ بھی پھر سے غور کرنا ہوگا ــــ ببرک کارمل اور نجیب اللہ کے خلاف لڑائی میں کام آنیوالوں کو تو شہید کہنے کا جواز ہو سکتا ہے، مگر صبغت اللہ مجددی، برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود اور گلبدین حکمت یار کی آپس کی جنگ میں کام آنے والوں کو ہم کیا کہیں؟ اس بے جواز قتل و غارت کو ہم کیا نام دیں ــــ پاکستان اور بنگلہ دیش اندرونی خلفشار کی وجہ سے کوئی مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل نہیں، یہی حال سوئیکارنو کے بعد انڈونیشیا کا ہے۔

کہنے کو ان ملکوں، ان اقوام کی [یہ ملک ہی ہیں، الگ الگ اقوام ہی ہیں، امت نہیں] ایک انجمن (ORGA-NIZATION) بھی ہے، مسلمان اقوام کی تنظیم ــــ O.I.C ــــ مگر اس کی کارکردگی دیکھ کر انگریزی زبان میں تو یہی کہا جا سکتا ہے ــــ Oh! I See

کبھی سہروردی مرحوم نے کہا تھا کہ جتنے صفر چاہے جمع کر لو، حاصل جمع صفر ہی رہتا ہے، یہی حال ان اقوام کا ہے آپس میں کٹے ہوئے، منقسم، الجھے ہوئے، دلوں میں کدورتیں لئے، کٹھے میزوں کے گرد بیٹھ بھی جائیں تو کیا حاصل۔ قرآن پاک کے لفظوں میں ان کے جسم ساتھ ساتھ ہیں مگر دل ایک دوسرے سے دُور، ایک دوسرے کے لئے اجنبی!

یہ نہیں کہ ان کے پاس وسائل نہیں۔ افرادی قوت دیکھئے تو دنیا کے وسط میں واقع، ساتھ ساتھ جڑے ہوئے ان ملکوں کی آبادی ایک ارب سے زیادہ۔ وسائل کے لحاظ سے دیکھیں تو ممالک تو کیا براعظم مل کر بھی ان کے حریف نہیں ہو سکتے، تیل کی اُس دولت سے مالا مال جس کے بغیر نہ مغرب کی صنعتیں چل سکتی ہیں اور نہ فوجی قوت حرکت میں آ سکتی ہے ــــ معدنی دولت کا بھی کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا، سونا، چاندی، تانبا اور دوسری قیمتی دھاتوں کے بے حساب ذخیرے قدرت کی طرف سے انہیں میسر ہیں۔

مگر یہ ساری دولت

غنی روزے سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

خیروں ہی کے چراغ روشن کرنے کے کام آتی ہے۔

تیل کے چند چشموں پہ قبضے کی خاطر عراق کویت کا جھگڑا چلا، دیکھا جائے تو یہ سارا تیل عالمِ عرب کی دولت ہے (امت کی بات چھوڑیں) کیا سارے عرب مل کر اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے؟ ایسا ہو جاتا تو عالمِ اسلام کتنے بڑے المیے سے بچا رہتا ـــــ آج بھی اگر عرب ممالک مل کر اپنے سارے وسائل، اپنی ساری دولت کو اجتماعی دولت اور ان ممالک کو دولتِ مشترکہ قرار دے دیں جس میں سب یکساں حقدار ہوں تو تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو سکتا ہے۔

عراق کی اس جنگ میں عراق پر تو جو گزری سو گزری عالمِ عرب کا اتحاد ایک سراب ہو کر رہ گیا۔

اب امریکہ کی فوجیں، امریکہ کی چھاؤنیاں، امریکہ کا بحری بیڑا، ان کی رگِ جان اپنے پنجوں کی زد میں رکھے ہوئے ہے اور یہ سب اس دستِ قاتل کو مسیحا اور نجات دہندہ سمجھے بیٹھے ہیں۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

آج اسرائیلی بھیڑیوں کو کھلی آزادی ہے کہ فلسطینی مسلمانوں پر جو ظلم چاہیں ڈھائیں، جتنا خون چاہے بہائیں، ہندوستان کو اجازت ہے مسلمانوں کے خون سے جب چاہیں ہولی کھیلیں، ان کے گھر بار کو جب چاہیں نذرِ آتش کر کے دیوالی منائیں۔

بزعمِ خود مہذب یورپ اپنے وسط میں واقع ایک مسلمان گروہ کو جو اپنی شناخت قائم رکھنے پہ مصر ہے، کے ساتھ ایسا وحشیانہ، بہیمانہ سلوک روا رکھ رہا ہے کہ چشمِ فلک نے کبھی دیکھا نہ ہو گا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ جو اخلاق سوز سلوک ہو رہا ہے وہ آج کی مہذب عیسائی دنیا کا مُنہ کالا کر دینے کے لئے کافی ہے ـــــ

کویت کی ہمدردی میں مگرمچھ کے آنسو بہانے والے اتحادی جو تیل کی دولت کے لالچ میں عراق پر چڑھ دوڑے تھے، ان بے کس، بے بس، مظلوم بوسنیائی مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لئے ہتھیار دینے کو تیار نہیں بلکہ یک طرفہ پابندی پر مصر ہیں، انسانی حقوق کے علمبردار ان ہزاروں عورتوں کو ان انسان نما درندوں سے رہائی دلانے کے لئے تیار نہیں، جو مہینوں سے ان کی ہوس کا نشانہ بن رہی ہیں اور مسلسل ان کے قبضے میں ہیں ـــــ یہ سب ہنگامی نہیں سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت ہو رہا ہے ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

عراق پر پابندی ہے، لیبیا پر پابندی ہے، بوسنیا پر پابندی ہے مگر اسرائیل اور بھارت سے چشم پوشی ہے۔

سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

چار سُو سے زیادہ فلسطینی بے سر و سامانی کی حالت میں کھلے آسمان کے تلے پڑے ہیں، کوئی ان کے حقوق کی بات نہیں کرتا، لاکھوں کشمیری بھارتی سنگینوں کی زد میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں ـــــ مگر دہشت گردی کا الزام لیبیا پر ہے،

زیرِ عتاب ایران ہے، کڑی نظر پاکستان پر ہے، سچ ہے،

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دردنیا کی متمول ترین بے ہنر قوموں کی تنظیم، ریزولیوشن پاس کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی، اس او آئی سی (OIC) کے متعلق ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

یہ جو حج پہ لاکھوں کا اجتماع ہوتا ہے اس کا مقصد کیا محض طواف ہے؟ حجرِ اسود کا ایک بوسہ ہے؟ آبِ زمزم کے چند گھونٹ ہیں؟

بے شک آپ بدامنی روکنے کے لئے جلوسوں کی، نعرے بازی کی اجازت نہ دیں مگر پرامن طور پر مل بیٹھ کر آمادہ بہ احتجاج لوگوں کی باتوں پر غور تو کیا جا سکتا ہے،

بادشاہتیں، امارتیں، صدارتیں، آمریتیں، بُری بھلی جمہوریتیں اس سب تضاد کے باوجود اپنی بقا کے تقاضوں کے پیشِ نظر سال کے بعد ایک بار ہی سہی کھلے دل سے ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سننے والی ایک سیاسی (سیاسی ہی سہی) میٹنگ کرنے میں کیا حرج ہے؟ جس میں باہمی تضادات اور بقا کے تقاضوں پہ غور کیا جا سکے، باہمی مفاد کے تقاضے کچھ تو ہم آہنگیٔ فکر و نظر پیدا کریں گے ـــــ کبھی تو کسی ایسی میٹنگ میں سیاسی لحاظ سے ہی سہی کوئی اور فیصل، کوئی اور ذوالفقار، ایک اور قذافی، ایک اور سوئیکارنو سامنے آسکتا ہے ـــــ

تیل کا ہتھیار دوبارہ قابلِ استعمال نہ سہی، اتحادِ فکر و نظر اور مشترکہ وسائل کو مشترکہ مفاد کے لئے استعمال میں لانے کے طریقے تو ڈھونڈے جا سکتے ہیں، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، فرانس اور امریکہ کے بنکوں اور ان کی معیشتوں کو سہارا دینے والا پیسہ عالمِ اسلام کی آزمائشوں، مشکلوں اور مصیبتوں کو کم کرنے اور اس کے مسائل حل کرنے کے کام بھی آسکتا ہے۔

درست ہے کہ سارا عالمِ اسلام مل کر بھی اسرائیل سے (جس کی پشت پر امریکہ کی تمام تر طاقت ہے) لڑ نہیں سکتا۔ پاکستان اس پوزیشن میں نہیں کہ کشمیر کی خاطر ہندوستان سے برسرِ پیکار ہو سکے۔ کوئی مسلمان حکومت مغربی ممالک کے علی الرغم بوسنیا میں ہتھیار نہیں پہنچا سکتی، لیکن اگر سارے مسلمان ملک امریکہ، یورپ اور ہندوستان سے مال درآمد کرنا بند کر دیں (برآمد کرنے کے لئے تو ان کے پاس کچھ ہے ہی نہیں) تو اس طرح سے یہ ون وے ٹریفک ہے جسے ویسے بھی بند ہو جانا چاہیئے، بند ہو جائے تو اس سے اچھا خاصا فرق پڑ سکتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک کی ساری برسرِ مشرقِ وسطےٰ سے واپس بھیجی جائے اور مقامی اور مسلمان ملکوں کی افرادی قوت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ پاکستان جیسے ملکوں کو ایسی اقتصادی امداد دی جائے جو اسے مغربی امداد سے بے نیاز کر دے تو پاکستان انہیں بے شمار چیزیں ایکسپورٹ کر سکتا ہے۔ پاکستان ایسے کارخانے لگا سکتا ہے جو انہیں روزمرہ استعمال کی چیزوں، چھوٹے ہتھیاروں

اور ایسی بہت سی دوسری ضرورتوں سے بے نیاز کردیں گی جن کے لئے وہ مغرب کے دستِ نگر ہیں۔

مگر یہ انہیں کون سمجھائے، اقبالؒ کی فکر کے وارث پاکستانی تو آپس کی بحث و تکرار ہی نہیں، کھینچا تانی میں اس درجہ مگن ہیں کہ انہیں کسی اور بات کی فرصت ہی نہیں، بوسنیا، فلسطین اور کشمیر کی حالت پہ یہاں کا عام آدمی کڑھتا ہے آنسو بہاتا ہے مگر وہ کر کچھ نہیں سکتا۔ ملک کے حاکم غیر ملکی حاکموں کی طرح ان سے بہت دُور ہوچکے ہیں۔ سیاسی جماعتیں صرف کرسی کے لئے جلسے جلوس کرتی ہیں۔

عام آدمی کی رائے اس کا ووٹ سب کچھ بے معنی ہوچکا ہے، وہ جانتا ہے کہ ووٹ اُن ڈبوں میں ڈالے ضرور جاتے ہیں، جو پولنگ اسٹیشنوں پر پڑے ہوتے ہیں، مگر ان کی گنتی کسی نئے ہی حساب کتاب کے قاعدوں کے مطابق کہیں اور ہی ہوتی ہے جس سے اس کا ووٹ بے وقعت، بے معنی اور بے حیثیت ہوچکا ہے، ـــــ صبح و شام فکر معاش کا مارا اب تو وہ "روندے سمر نا دے بال" کی آواز بھی نہیں اٹھا سکتا کہ اسے اپنے روتے ہوئے بچوں کا خیال ستاتا رہتا ہے۔

ہم پاکستان کے اربابِ حل و عقد سے خدا کے نام پہ اپیل کرتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے ذاتی مفادات سے اُوپر اُٹھ کر، او آئی سی کے ذریعے ہی سہی، ملت کو اجتماعی مفادات کی راہ سمجھائیں اور ٹھوس اقدامات کی فوری ضرورت کا احساس دلائیں ورنہ یہود و ہنود کی چالیں سپین کی تاریخ دہرانے پہ تلی بیٹھی ہیں۔ ان کی چالوں کو ہمارا اتحاد، اتفاق اور اجتماعی عمل ہی ناکام بنا سکتا ہے اگر ہم نے اپنے فرض سے مُنہ موڑا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے گی۔

اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے کیونکہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کردے گا ـــــ حضرت عمرؓ

تحریک کا ایک اور ہمدم ٹھنڈے سائے سے محروم ہوگیا

محترم شیخ اللہ دتہ (سراج منیر) صاحب کی والدہ محترمہ کا پچھلے ماہ انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مرحومہ کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وابستگانِ تحریکِ طلوعِ اسلام میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو شیخ صاحب سے واقفیت رکھتا ہو اور ان کی والدہ محترمہ سے متعارف نہ ہو۔ راقم کو پہلی بار ان کے آبائی گاؤں "پنج کسی" میں مرحومہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کیا بات تھی! کبرِ سنی کے باوجود، قویٰ مضبوط، حواس قائم اور حافظہ مربوط تھا، نگاہ میں کشادگی، قلب میں وسعت، مزاج میں رعب اور دبدبہ غالب، لب و لہجہ ٹھیٹھ پنجابی اور اس میں وہ خلوص و محبت کہ جو ایک دفعہ ان سے ملا اُن کا گرویدہ ہوکر رہ گیا۔

اپنوں، بیگانوں میں "اماں جی" کے نام سے موسوم۔ بظاہر ان پڑھ لیکن موضع پنج کسی کے قرب و جوار میں کم و بیش تین نسلوں کی استاد۔ قرآن پڑھنے اور پڑھانے کا شوق اس حد تک غالب کہ عمر کا بیشتر حصہ اس خوف سے گاؤں میں اکیلے گزار دیا کہ مبادا کوئی بچی قرآنی تعلیم سے محروم رہ جائے۔ مگر افسوس کہ علالت اور اجل کے ہاتھوں یہ پروگرام جاری نہ رہ سکا۔

ماں کی محرومی کا صدمہ کس قدر جانکاہ ہوتا ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مگر اکیلا بیٹا ہونے کی وجہ سے شیخ صاحب پر یہ صدمہ اور بھی گراں گزرا۔ صدمے کے اثرات کو بانٹنا اگرچہ مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت تحریک کے سینکڑوں قلوب صدقِ دل سے شیخ صاحب کے اس غم میں شریک ہیں۔ شیخ صاحب کے علاوہ اس غم میں ہم ان کی اہلیہ محترمہ (کہ مرحومہ ان کی پھوپھی تھیں)، ان کے بچوں اور بچیوں کے بھی برابر کے شریک ہیں کہ اس قرآنی گھرانے کا غم سب کا مشترکہ غم ہے۔

ہماری دُعا ہے کہ خدا کے سحابِ کرم کی رحمتیں "اماں جی" مرحومہ پر سایہ فگن ہوں اور جنت کی فضائیں ان کا استقبال کریں۔

جگر فگار

محمد لطیف چوہدری
ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام

بشیر احمد عابد
کویت

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲/۱۴۱)

"اُولُوالنُّھٰی"

(بیادِ علامہ غلام احمد پرویزؒ)

پرویزؒ صاحب کے بارے میں ایک تعجب انگیز بات یہ بھی ہے کہ آپ مسلمانوں کے بعض صدیوں پرانے عقائد و نظریات کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے! اس ضمن میں سوال کیا جاتا ہے کہ پرویزؒ صاحب کے علاوہ بھی کسی نے ان عقائد و نظریات پر اعتراض کیا ہے؟ آپ سے پہلے اور آپ کے ہمعصر علماء میں سے کسی ایک نے بھی ان کی صحت کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور امت کی اکثریت ان پر متفق ہے۔ کیا یہ سب باطل ہے؟ جھوٹ ہے؟ اگر اس سوال کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے جب کہا جاتا ہے کہ سلف صالحین میں سے وہ مقدس ہستیاں جن کی ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزری! جو زہد و تقوٰے کے پیکر تھے! جن کے علم و بصیرت کا ایک جہان معترف تھا! کیا سب جاہل اور نادان تھے؟ اب معلوم نہیں کہ پرویزؒ صاحب اپنی حیات میں ان سوالوں سے کیسے نمٹتے تھے! لیکن یقین جانئے جب ہم سے یہ کچھ پوچھا جاتا ہے تو ہمارے تو چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ پرویزؒ صاحب کے ادنیٰ مگر شائق طالب علم کی حیثیت سے ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب دیا جائے۔ لیکن ان حضرات کے دلائل کچھ ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ! ہم کیا ہمارے فرشتے بھی ان کی تسکین نہ کر سکیں! یہ تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنی کتاب، اپنے قانون اور اپنی بات کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے اور دین اسلام کے لئے جو بنیادیں تجویز کر رکھی ہیں وہ اب بھی اپنی خالص حالت میں قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ورنہ ہماری حالت بھی دیگر عوام سے مختلف نہ ہوتی ـــــ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ـــــ جو صحیح راستہ گم کر بیٹھے اور غلط راہوں پر اتنی دور تک نکل گئے کہ جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔ جب تک قرآن باقی ہے ہماری بازیابی کا امکان باقی ہے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ عمر بھر قرآنِ کریم کی خالص تعلیمات پیش کرتے رہے۔ آپ اپنے متعلق فرماتے ہیں۔

" میری پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی جس کی فضا شریعت و طریقت دونوں کی قدامت پرستی سے معمور تھی۔ " [1]

ایسی فضا میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے مسلک کو تقاضائے دین سمجھ لیا جاتا ہے اور اس میں کسی چیز کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل اور سند یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی بڑے امام یا ولی اللہ کا قول ہو یا عوام کی اکثریت اس پہ ایک مدت سے عمل پیرا ہو۔ پرویزؒ صاحب کہتے ہیں۔

" اور میرا قلبِ متجسس ہر دعویٰ کے لئے دلیل کا متقاضی تھا۔ "

پرویزؒ صاحب قرآن کریم کے نہایت (DEVOTED) طالب علم تھے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اس حکمتِ عظیم کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ آپ نے اس کتابِ مقدس کے حقائق کی حقیقی تقدیس کو اجاگر کیا، خود غرض انسانوں کی سرکشی اور ضد نے ان حقائق کو یا تو نظر انداز کر دیا تھا یا پھر ان پر اپنے مفاد پرستانہ جذبات و نظریات کی تہہ چڑھا رکھی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ حق کو کھلے عام شکست نہیں دی جا سکتی، بلکہ اس سے بھی عظیم حقیقت یہ ہے کہ حق کو قطعی شکست نہیں دی جا سکتی! حق کو یا تو دبا دیا جاتا ہے یا اس کی تلبیس کر دی جاتی ہے، یہ ازل سے ہو رہا ہے اور جب تک باطل موجود ہے، ایسا ہوتا رہے گا۔

پرویزؒ صاحب نے قرآنِ کریم کی تعلیمات کو ہر آمیزش سے پاک کر کے پیش کیا، آپ کے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے، جس کے حقائق کو علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے، جس کے احوال و قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں اور ان کی صحت و صداقت کو تاریخِ انسانیت کے اوراق میں دیکھا جا سکتا ہے، یہ ویسے ہی محکم ہیں جیسے کائنات کے دیگر طبیعی قوانین! انہیں کسی بھی خارجی لبادے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ انسان خدا کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا، گو کہ یہ چل رہا ہے! لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ یہ غلط راستے پر چل رہا ہے۔ پوری تاریخ گواہ ہے کہ انسان کا ہر قدم اسے اپنی منزل سے دُور لے جا رہا ہے، حتیٰ کہ جو منزل اس نے اپنے لئے خود تجویز کر رکھی ہے، یعنی امن و خوشحالی کی منزل، یہ اس سمت بھی بڑھتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے انسان کے لئے رہنمائی اپنے اوپر فرض قرار دے رکھی ہے، خدا کو اس کا علم ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو یہ جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لئے وہ انسان کی طرف بار بار لوٹ کر آتا ہے ـــ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ـ (۴/۲۷)

---

[1] تبویب القرآن از علامہ غلام احمد پرویزؒ۔

— اور اپنی رہنمائی انبیائے کرامؑ کی وساطت سے حسبِ ضرورت پہنچاتا رہتا ہے، اس رہنمائی کو نبی اکرمؐ پر تمام تر مقتضیات کے ساتھ مکمل کر کے تا ابد محفوظ کر دیا، بعینہٖ ایک بیج کی طرح، جس کے اندر ایک مکمل نظامِ حیات، ترقی اور نشوونما کے جملہ مقتضیات اور اصولوں کے ساتھ تہہ بہ تہہ کر کے خول در خول محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اب جو بھی، جہاں اور جس دَور میں بھی اسے منشائے فطرت کے مطابق کاشت کرے گا، بھرپور فصل کاٹے گا! انبیائے کرام کا یہی طریق تھا، خدا کے احکام و قوانین کو ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنا، ان کے پاس اپنی نبوت، رسالت اور صداقت کی کوئی سند اور دلیل نہیں ہوتی تھی بجز اس کے کہ وہ اپنے قول کو نتائج کی رُو سے سچ ثابت کر دکھائیں، ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ لوگوں کے اسلاف کا مسلک ہوا کرتا تھا، لوگ ان کا تمسخر اڑاتے! انہیں جاہل اور پاگل کہتے! انہیں جھوٹا قرار دے کر ان پر کفر کے فتوے صادر کرتے اور ان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ ہم نہ تو گمراہ ہیں، نہ پاگل اور نہ جھوٹے! ہم تو فقط خدا کے رسول ہیں اور اس کا پیغام تم تک پہنچانے آئے ہیں کہ تم اپنی نشوونما کے لئے، امن و سلامتی کے لئے، خوشحالی و استحکام کے لئے، صرف اور صرف خدا کے قوانین کا اتباع کرو، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کائنات کی ہر چیز کی طرح تمہاری نشوونما بھی خوش اسلوبی سے سرانجام پائے گی، ہم پر بھروسہ کرو، ہمارا ساتھ دو، ہم تمہیں امن و سلامتی کی صحیح سمت لے جائیں گے۔ وہ کہتے — اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ — کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ خدا اپنے پیغام کو تم تک ایک ایسے آدمی کے ذریعے کیوں پہنچا رہا ہے جو تم میں سے ہی ہے اور تمہارے جیسا ہی ہے۔ تاکہ وہ تمہیں اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرے اور تم تباہیوں سے بچ جاؤ (۷/۶۳)۔ یہ رسول لوگوں کے اس نظامِ زندگی کو چیلنج کرتے جس پر وہ اور ان کے اسلاف صدیوں سے عمل پیرا چلے آ رہے ہوتے تھے اور انہیں یہ چیلنج بڑا عجیب لگتا، وہ حیران ہوتے کہ ان کے آباء و اجداد میں بڑے بڑے جید علماء اور مقدس ہستیاں گزری ہیں، لیکن کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہمارے عقائد و نظریات غلط ہیں۔ یہ شخص ایسا کیوں کہتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ کام بڑا ہی نازک اور مشکل ہوتا ہے۔ لوگوں کو اپنے عقائد و نظریات بڑے ہی عزیز ہوتے ہیں خواہ یہ کتنے ہی مضر اور مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں! انسان کی تمدنی زندگی میں جو عقائد و نظریات پائے جاتے ہیں یہ نہ تو آسانی سے داخل ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں آرام سے نکالا جا سکتا ہے، علم و بصیرت کی رُو سے تو یہ مزید دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ اس لئے کہ ان عقائد میں سے اکثر کی بنیاد علم و بصیرت پر نہیں بلکہ تقلید و توہم پرستی پر ہوتی ہے، لوگوں کو اس کا عادی بنا دیا جاتا ہے، شاطر اور چالاک لوگ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ہمیشہ سے اچھوتے ہتھکنڈے استعمال کرتے چلے آئے ہیں جس کی بنا پر لوگوں کا ایک مخصوص مزاج بن گیا ہے، لہٰذا جب تک ان کے مزاج کے مطابق روش اختیار نہ کی جائے ان پر کوئی بات اثر انداز نہیں ہوتی، ہنگامہ آرائی، ہلڑبازی، گھیراؤ جلاؤ — لوگوں کی جذباتی تسکین کا

یاعث بنتے ہیں اور اس شور و غوغا میں جو بات کبھی ان تک پہنچ جائے سیدھی دل کی گہرائی میں پیوست ہو جاتی ہے۔
یہ جو آئے دن آپ وعظوں اور تقریروں میں علماء اور سیاست دانوں کی چیخ و پکار ملاحظہ فرماتے ہیں، دراصل اس کے پس پردہ یہی نفسیاتی حربہ کارفرما ہوتا ہے۔ انبیائے کرامؑ حضرات نہایت بلند اوصاف اور انتہائی محکم کردار کی حامل ہستیاں ہوا کرتی تھیں، وہ چکنی چپڑی باتوں سے نہیں بلکہ صاف اکھرے اور دو ٹوک الفاظ میں اپنا پیغام پہنچاتے تھے اور لوگوں کو نہایت شفقت سے ان کی غلط روشِ زندگی سے آگاہ کرتے، وہ اپنا پیغام علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتے جبکہ لوگوں کی اکثریت کا یہ عالم ہوتا کہ وہ عقل و بصیرت کے پاس تک نہ پھٹکتے اور اپنی جہالت پر نازاں رہتے۔ حضور نبی اکرمؐ کی جب بعثت ہوئی تو اس وقت معاشرہ یہود و نصاریٰ کے زیرِ اثر تھا، ان کے عقائد و نظریات صدیوں سے مسلّمہ چلے آ رہے تھے، حضورؐ نے ان کے باطل عقائد کی نفی کی، نتیجتہً آپ کی شدید مخالفت ہوئی، آپ پر طرح طرح کی الزام تراشیاں ہوئیں، آپ کو جھوٹا کہا، پاگل کہا اور کہا کہ کیا خدا کو کوئی دوسرا نہ ملا جو ہمیں ہمارے اسلاف کی کج روی سے آگاہ کرتا! بڑی بڑی مقدس ہستیاں گزریں لیکن کسی کو علم نہ ہو سکا کہ ہم غلطی پر ہیں۔ عزرا نبی، نحمیاہ نبی، جوزیفس، سینٹ جیروم، سینٹ برناس، سینٹ پال، کیا سب گمراہ تھے؟ اس کا کیا جواب دیتے سوائے اس کے کہ

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ

یاد رکھو! خبیث اور طیب کبھی برابر نہیں ہو سکتے، خواہ خبیث کی کثرت ہی کیوں نہ ہو! کسی چیز کی کثرت اس کے صحیح ہونے کی دلیل قطعی نہیں بن سکتی۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥

لہٰذا، اگر تم عقل و شعور رکھتے ہو اور کوتاہ نگہی اور بے بصری سے کام نہیں لیتے تو تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اس سے تم کامیاب زندگی بسر کرو گے۔ (۵/۱۰۰)۔

ہاں یہ سچ ہے! اگر عقل و شعور سے کام لیا جائے تو حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن مذہب کی دنیا میں ایسا تردد کون کرتا ہے، مذہب کی دنیا میں لوگ سوچ و فکر سے کام نہیں لیا کرتے، مذہبی پیشوائیت نے عوام کی سوچوں کو مفلوج کر رکھا ہوتا ہے، ان کی آنکھوں پہ پردے، کانوں میں ڈاٹ اور دلوں پر تالے ڈال دیئے جاتے ہیں، ان مذہبی پیشواؤں کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مذہب کو عامۃ الناس کے لئے نہایت سلیس اور مقدس بنا دیتے ہیں، کلمہ پڑھا اور مسلمان کہلائے، بعض اوقات اس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، مسلمانوں جیسا ہے! مذہب کو اس قدر محدود کر دیا جاتا ہے کہ عام آدمی کو زیادہ مغز ماری کی ضرورت ہی نہیں آپ نے دیکھا ہو گا کہ اکثر لوگ اپنے آپ کو سیدھا سادہ مسلمان ظاہر کر کے کس قدر فخر محسوس کرتے ہیں!

سیدھے سادے کا مطلب ہوتا ہے کہ صاحب کچھ نہیں جانتا!

علامہ غلام احمد پرویزؒ ایک غیر معمولی انسان تھے، تاریخِ انسانیت میں ایسی ہستیاں خال خال نظر آتی ہیں، علم و بصیرت کے یہ پیکر ہزاروں سال بعد چمنِ ہستی میں نمودار ہوتے ہیں اور انسانیت کے ظلمت کدوں کو اپنے نورِ بصیرت سے روشن کرتے ہیں، آپ دینِ اسلام کے شیدائی اور اس کی حقانیت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے تھے، آپ قرآن کریم کو آخری اور محفوظ کتاب سمجھتے تھے اور اس کے احکام و قوانین کو دین میں آخری حجت تسلیم کرتے تھے آپ کے نزدیک نبیٔ اکرمؐ کی حیاتِ اقدس قرآنِ کریم کے اصولوں کی بہترین نمونہ تھی جس کا اتباع ہر مسلمان پر فرض ہے آپ دینِ اسلام کو خالص قرآنی بنیادوں پر قائم دیکھنا چاہتے تھے، آپ کے علم و تحقیق کے مطابق خلافتِ راشدہ کے بعد دین کی قرآنی بنیادیں دیدہ و دانستہ نگاہوں سے اوجھل کر دی گئیں اور ایک سوچی سمجھی سکیم کے بعد مسلمانوں میں غیر قرآنی تصورات کو فروغ دیا گیا، قرآنِ کریم کی تعلیمات نے امتِ مسلمہ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا تھا اور اس کے ہاتھوں تمام باطل قوتوں ذلت آمیز شکست کھانی پڑی تھی۔ ان سازشوں اور مکر و فریب کا مقصد امتِ مسلمہ کو عزت اور طاقت سے محروم کرنا تھا، اس بدنصیب امت کو جو تھوڑی بہت خوشحالی اور سلامتی نصیب ہوئی تھی وہ دشمن کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی، دشمن خوب جانتا تھا کہ یہ عزت اور عروج، امن اور خوشحالی قرآنِ کریم کی تعلیمات کا نتیجہ ہے، لہٰذا اس کا پہلا مگر انتہائی مہلک وار قرآن کریم پر ہوا، تورات اور انجیل کی طرح اس کتابِ مکنون کو نہ تو تلف کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس میں کوئی تحریف ممکن تھی، دنیا کی کوئی طاقت یہ نہیں کر سکتی، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے، اس کے خلاف ایک حرفِ شکایت بھی زبان پہ نہیں لایا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے احکام و قوانین نہایت واضح ہیں اور ان کی بنیاد نتائج پر ہے، دوسرا اس کی زبان انتہائی سلیس اور غیر مبہم ہے، عربی زبان کی فصاحت و بلاغت پوری دنیا میں معروف ہے۔ اہل السنۃ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ عربی زبان ان خامیوں اور کمزوریوں سے مبرا ہے جو کسی زبان میں ابہام کا باعث ہوتی ہیں، امت کو قرآنِ کریم سے محروم رکھنا انتہائی نازک اور مشکل کام تھا، ایسا کام صرف مذہبی پیشوائیت سرانجام دے سکتی ہے، لیکن اسلام میں اس کا وجود سرے سے معدوم تھا۔ اسلام طرزِ حیات ہے نہ کہ مذہب! اس کے اصول و قوانین زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہیں، اس میں ربوبیت، ملوکیت اور الٰہت کے فرائض اجتماعی طور پر ایک سنٹرل اتھارٹی کی قیادت میں سرانجام پاتے ہیں، قرآنِ کریم اس اتھارٹی کو "اللہ و رسول" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ "کرائے کے ملّا" کا تصور بہت بعد کی پیداوار ہے۔ صدرِ اوّل کے حکمرانوں میں سے کسی کو بھی تلاوتِ کلامِ پاک کے لئے قاری کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اس سعادت کو خود حاصل کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ جب زمامِ اقتدار ان لوگوں کو منتقل ہوئی جن کے اسلاف کو محمد رسول اللہ والذین معہ کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھانی پڑی تھی، تو انہوں نے ایک تو اس رسوائی کا بدلہ

لئے اور دوسرا اپنی مبنی بر باطل طرز زندگی اور عیش پرستیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اس ہامانی لشکر کو ... جسے عرفِ عام میں مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ شروع سے لے کر ... نبی تک خدا کے دین کو تباہ کرنے میں یہی طبقہ پیش پیش رہا ہے۔ خواہ یہ تورات ہو، انجیل ہو یا اب قرآن کریم! ... آسمانی کتب کے حقائق کو مسخ کرنے میں ان کا کردار نہایت اہم رہا ہے، قرآن کریم نے اس طبقے کو جادوگر کہا ہے۔ (ساحرین فرعون)۔ آپ نے جادوگروں کو دیکھا ہوگا کہ کس طرح عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہیں مخصوص لب ولہجہ، لباس اور حلیہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہی کچھ مذہبی پیشوا کرتے ہیں جس طرح جادوگر نہایت چابکدستی سے سراب کو حقیقت میں بدل دیتے ہیں، اسی طرح انہوں نے نہایت احترام سے قرآن کریم کو ریشمی غلاف میں لپیٹا، سینے سے لگایا، چوما اور انتہائی ادب کے ساتھ اٹھا کر طاق میں رکھ دیا، خود عصا لے کر منبر پر کھڑے ہو گئے اور اپنی من گھڑت کہانیوں کو خدا اور رسولؐ کا حکم قرار دے کر عوام کو بھیڑوں کی طرح ہانکنا شروع کر دیا۔

محترم پرویزؒ صاحب نے دشمن کی انہی چالوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ آپ نے ۵۰ سال تک اس موضوع پر کام کیا، اس دشت کی سیاحی اور صحرا نوردی کے نتیجے میں آپ کی تصنیفات اور تالیفات کا ایک انبار لگ گیا۔ آپ نے صدیوں سے متوارث مسلمانوں کے ایک ایک عقیدے اور عمل کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھا، جس کو کھرا پایا اس کا کھل کر پرچار کیا اور جو غلط نکلا اسے بلا خوف، دو ٹوک الفاظ میں رد کر دیا۔ آپ کی تحقیقات کی پہلی زد مذہبی پیشوائیت پر پڑی، لہٰذا، اس طبقے کی طرف سے آپ کی شدید مخالفت کی گئی، بالخصوص علماء کا وہ طبقہ اس مخالفت میں پیش پیش رہا جس نے کہ مذہب کو اپنی عزت، وقار اور روزی کا ذریعہ بنا رکھا تھا (تجعلون رزقکم) وہ تلملا اٹھے اور قریب ایک ہزار علماء نے آپ پر کفر کا فتوےٰ عائد کر دیا، آپ پر طرح طرح کے بہتان اور تہمتیں لگائی گئیں، محرفِ قرآن، منکرِ حدیث، تین نمازوں اور نو روزوں کا بانی، جن بھوت کو غیر مہذب انسان قرار دینے والا، داڑھی منڈا اور نہ جانے کیا کیا دشنام طرازیاں ہوئیں جب کہ قصور صرف اتنا تھا کہ آپ قرآن کریم کی تعلیمات کو ہر آمیزش سے پاک کر کے پیش کرتے تھے۔

رہا یہ سوال کہ پرویزؒ صاحب ایسا کیوں کرتے تھے، جب کہ سلف صالحین اور آپ کے ہمعصر علماء میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا، اس کا کچھ جواب تو آپ کو مندرجہ بالا تفصیل سے مل چکا ہوگا، یہی اعتراض انبیاء کرامؑ پر کیا جاتا تھا، پرویزؒ صاحب تو خود کو ان قدوسیوں کی خاکِ پا بھی نہیں سمجھتے تھے! ہم سلف صالحین کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتے پرویزؒ صاحب کے ہمعصر علماء سے اچھی طرح واقف ہیں، کچھ تو اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن ایک اکثریت آج بھی بقیدِ حیات ہے، انہیں ہم سن سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر نہایت مودبانہ طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ

جناب یہ جو کچھ آپ دین کے نام سے پیش کر رہے ہیں اس کے لئے خدا نے کیا سند نازل کی ہے؟ یقین جانیئے! ان میں سے ایک کے پاس بھی اپنے کسی بھی عقیدے کے لئے کوئی خدائی سند موجود نہیں! ان کے پاس جو کچھ ہے سب خود تراشیدہ ہے! کچھ تو انہیں ورثے میں ملا ہے اور کچھ یہ خود تراشتے رہتے ہیں! یہ قرآن اور حدیث کی رُو سے جو کچھ بھی پیش کرتے ہیں، وہ اکثر افترا پردازی ہوتی ہے یا ان کی کم علمی کا نتیجہ! اہلِ علم حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت ہر سوسائٹی میں ذہانت کے ادنیٰ درجے پر ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر کو خود علم نہیں ہوتا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یا لکھ رہے ہیں اس کی بنیاد کیا ہے؟

یاد رکھئے! دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے، نبی اکرمؐ سے اہل کتاب جب بھی اپنے عقائد و نظریات کی بحث کرتے تو آپؐ کو حکم ہوتا ــــ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ ــــ ان سے کہہ دو کہ خدا کی وحی میں تمہارے عقائد و نظریات کی کوئی سند نہیں پاتا (۶/۱۴۶)۔ خدا کی وحی قرآن ہے، نبی اکرمؐ کی طرف صرف قرآن وحی ہوا ہے ــــ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ (۶/۱۹)۔ لہٰذا دین میں کسی بھی عقیدے، مسلک یا واقعہ کی آخری اور حتمی سند اب قرآن کریم ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے جس کی قبولیت کا معیار ہمارے ایمان کا تقاضا نہیں! اسے اس کی افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا اور اگر کوئی چیز امت کے لئے مفید ہے تو اسے جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ پرویزؒ صاحب کا انحراف اور انکار خدا اور رسولؐ سے نہیں تھا بلکہ ان باطل عقائد و نظریات سے تھا جو صدیوں سے مقدس، متوارث اور مستحکم چلے آ رہے ہیں اور جن کی وجہ سے مسلمان عزت و شہرت کی بلندیوں سے گر کر اس وقت ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پرویزؒ صاحب دردمند دل رکھتے تھے آپ کے سامنے امت کی یہی زبوں حالی تھی، اپنا کوئی بھی ذاتی مفاد نہ تھا، آپ کی جملہ سعی و کاوش کا مطلوب و مقصود یہ تھا کہ امت پھر سے اپنی گم گشتہ جنتِ ارضی کو پالے! اس امت کو جو اقوامِ عالم کی امامت کا منصب عطا ہوا تھا یہ اس کی اہل بن جائے اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ اسے اس کی اصل بنیادوں پر استوار کیا جائے، آپ کی کوہکنی اور خارا شگافی سے جو عظیم لٹریچر وجود میں آیا وہ نہ صرف تعداد اور ضخامت میں بے مثال ہے بلکہ حق و صداقت میں بھی لاثانی ہے! اگر آپ صرف اتنا کرتے کہ اسلاف کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تو یہی لٹریچر آپ کو عزت و شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیتا، اگر لوگ دو دو صفحے کی چند کتابیں، اور وہ بھی ایسی کہ جن میں خرافات بھری ہوں زبدۃ العلماء، خطیب الامت اور مفتیٔ اعظم جیسے بلند خطابات حاصل کر سکتے ہیں تو آپ بجا طور پر ان سب کے میرِ کارواں کہلانے کے مستحق ہیں۔

پرویزؒ صاحب ہر طمع و آز سے بالا، ہر طعن و ملامت سے بے خوف، دینِ خداوندی کو خالص بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز رہے، آپ نے قیامِ پاکستان کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کیا قدم بہ قدم قائد اعظمؒ کا ساتھ دیا، آپ کی ان خدمات کا اعتراف آپ کے بعض کٹر مخالفین نے بھی کیا ہے۔ قائد اعظ

آپ کی جو قدر و منزلت تھی اس کے تحریری ثبوت موجود ہیں اور اس حقیقت کی شہادت قائد اعظمؒ کا ہر ساتھی دے گا آپ ہی ایک ایسی شخصیت تھے جو قائد اعظمؒ سے بغیر پردکول کے مل سکتے تھے، آپ چاہتے تو قیام پاکستان کے بعد اعلیٰ عہدہ حاصل کر سکتے تھے، آپ چاہتے تو اپنے مشن کے لئے حکومت کا مضبوط سہارا حاصل کر سکتے تھے۔ آپ نہ صرف قائد ہی کے ساتھی تھے بلکہ علامہ اقبالؒ کے بھی لائق و فائق شاگرد رہے، آپ اقبالؒ کے بہترین ترجمان تھے کلام اقبال کو کوئی بھی پیش کرے تو نگاہیں احتراماً جھک جاتی ہیں، آپ نے کلام اقبال اور قرآن کریم کو جس حسین امتزاج سے پیش کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی، آپ چاہتے تو اپنی اس اقبال نوازی کا بھرپور فائدہ اٹھا سکتے تھے. لیکن پرویزؒ صاحب ان سب سے بے نیاز رہے، نہ کوئی سہارا لیا اور نہ کوئی حربہ استعمال کیا، صرف قرآن کریم کا مضبوط سہارا اتھامے رکھا. آپ رقمطراز ہیں[1]:

> "میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں، میری زندگی بچپن سے لے کر اس وقت تک اس کتاب عظیم کے ساتھ متمسک رہی ہے. ابتداً میں نے بھی (جیسے کہ ہمارے ہاں کا معمول ہے) اس کا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا. لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی! بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی۔
>
> منزل و مقصود قرآں دیگر است رسم و آئینِ مسلمان دیگر است"

یہ "دیگر است" کیا ہے، اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں، نصف صدی پر محیط کسی کی علمی کاوش کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اسے کوئی بھی غیر قلم سرانجام نہیں دے سکتی، اسے جاننے کے لئے کسی کو اگر دلچسپی ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ پرویزؒ صاحب کے اوریجنل یعنی کہ بنیادی لٹریچر کی طرف رجوع کرے. آپ نے اسلام کے مروجہ عقائد کو ایک ایک کر کے قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا اور یوں جو کچھ نظر آیا اسے صدق و عدل کے ساتھ قلمبند کر دیا ہے. آپ نے وہ نہیں کیا جو ہر کسی نے کیا ہے کہ جو بات اسلاف کہہ گئے اس سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹنا خواہ اس کے لئے دن کو رات اور رات کو دن کیوں نہ کہنا پڑے! یا یہ کہ چلے تھے زکوٰۃ کی تفصیلات طے کرنے، جا پہنچے صدقات پہ! صدقات کے مصارف کو زکوٰۃ کے مصارف قرار دے دیا اور یہ کہہ کر مطمئن ہو گئے کہ صدقات اور زکوٰۃ مترادف ہیں. یاد رکھئے! قرآن کریم نے کوئی بھی دو لفظ ہم معنی استعمال نہیں کئے ہیں، اس کا ہر لفظ منفرد اور جداگانہ معنی رکھتا ہے۔

پرویزؒ صاحب کے لٹریچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے اپنی کسی بھی تحریر کو سہو و خطا سے منزہ نہیں سمجھا ہے، نہ ہی اپنی کسی بات کو حرفِ آخر کہا ہے، اس کا اعتراف آپ کی ہر تحریر میں موجود ہے، آپ نے قرآن فہمی کا وہ طریق

---

[1] لغات القرآن، از غلام احمد پرویزؒ۔

اختیار کیا ہے جو خود قرآن کریم کا تجویز کردہ ہے' آپ کے مطابق اس طریق سے ہر کوئی از خود قرآنی حقائق تک پہنچ سکتا ہے اسے کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے' کوئی بھی چالاک اور مکار انسان اسے خدا اور رسولؐ کے نام پر دھوکہ نہیں دے سکتا' وہ ہر طرح کی عیاری اور مکاری سے محفوظ ہو جاتا ہے' ایسا شخص علم و بصیرت کی شمع سے اپنے راستے روشن کرتا ہے' اسے مقدس ہستیوں اور مقتدر شخصیتوں کا خوف باقی نہیں رہتا' وہ اصولوں اور قوانین کی تقدیس کا حامی بن جاتا ہے' وہ اگر ڈرتا ہے تو ان کی خلاف ورزی سے' کیونکہ وہ بالتحقیق ایمان رکھتا ہے کہ ان قوانین کے نتائج بڑے اٹل ہیں اور ان کی خلاف ورزی بڑی ہی خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہے' وہ خود بھوکا رہ کر دوسروں کی بھوک اس لئے نہیں مٹاتا کہ اسے خدا سے بہت محبت ہے یا یہ کہ ایسا کرنا انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے' ٹھیک ہے' یہ جذبات بھی قابلِ احترام ہیں' لیکن فی الحقیقت اس کی نگاہ میں یہ عمل فطرت کا اٹل قانون ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اس نے اس کی خلاف ورزی کی اور اس پر عمل نہ کیا تو معاشرہ آگ کا جہنم بن جائے گا جس میں کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا' خدا کے قوانین پر ایسا ٹھوس اور کوہ آسا ایمان قرآنِ کریم کے صحیح فہم سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ محترم پرویزؒ صاحب نے قرآن کریم کا صحیح فہم دینے کی مقدور بھر کوشش کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن فہمی کی بہترین کوشش ہے' لیکن پرویزؒ صاحب کا کوئی بھی شاگرد اسے آخری اور سہو و خطا سے منزہ نہیں سمجھتا' پرویزؒ صاحب کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے ہمارے قلوب و اذہان کو کسی بھی شکنجے میں نہیں جکڑا ہے' ذہنی' علمی' نفسیاتی' ہر لحاظ سے ایسی بلند نگہی اور وسعتِ قلبی عطا کی ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی خطا کرتے دکھائی دیتا ہے ہمارا ہاتھ بلا خوف و تردد سیدھا ان کے گریبان پہ پڑتا ہے!

خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

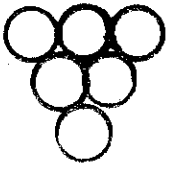

A CLEAR CONSCIENCE NEVER FEARS THE MIDNIGHT KNOCK ON THE DOOR.

…طفیل
ایم۔ایس سی فزکس

روحانی ملوکیت

انسانی آزادی کو کچلنے کے لئے شہنشاہیت نے جبر و استبداد کی پالیسی پر عمل کیا۔ بادشاہوں نے اپنی ملوکیت کی بنیاد استحصال اور استیصال پر رکھی۔ اس کے برعکس صوفیاء کرام نے توکل، قناعت اور راضی برضا جیسی تعلیمات پر اپنی روحانی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ روحانی ملوکیت کے ماٰخذ کو سمجھنے کے لئے ہمیں تاریخ سے رابطہ قائم کرنا ہوگا حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد بعض روایات کے مطابق اسلامی معاشرہ خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں آگیا اور مذہبی، سیاسی اور نظریاتی اختلافات کی بنیادوں پر معاشرے کی تقسیم کا عمل شروع ہوگیا۔ خلفاء راشدین کا دور ختم ہوتے ہی اقتدار کی رسہ کشی اسلامی معاشرے میں دو متصادم رجحانات پیدا کرنے کا سبب بنی۔ ایک رجحان یہ تھا کہ سیاسی کش مکش اور اقتدار کی جنگ نے معاشرے میں جو غیر یقینی فضا پیدا کر دی ہے اس کے سدِباب کے لئے کسی ایک سیاسی فریق سے ہم نوائی کی جائے۔ اس رجحان کے علمبرداروں کے مطابق سیاسی خلفشار کا انسداد سیاست میں شرکت ہی سے ممکن تھا۔ جب کہ اس کے برعکس دوسرا رجحان یہ تھا کہ اس تصادم میں فریق بننا مزید خون ریزی کا سبب ہوگا۔ فلہٰذا دنیاوی معاملات اور سیاسی امور سے کنارہ کشی ہی میں عافیت ہے۔ علیحدگی اور کنارہ کشی پر مبنی اس رجحان نے صوفیاء کرام کے طبقے کو جنم دیا۔

صوفیاء کرام کے سیاسی عزائم چونکہ معدوم ہو چکے تھے چنانچہ حکمران طبقے سے ان کا کوئی سیاسی تصادم نہیں ہوا۔ …ہمیشہ حاکمِ وقت سے وفاداری کے اصول پر قائم رہے۔ اس ضمن میں نظام الدین اولیاء کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو اپنے …نے میں ہر سلطان کے وفادار رہے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں حاکمِ وقت سے مفاہمت کی پالیسی پر عمل کیا ــــ …الدین خلجی کے بہیمانہ قتل کے بعد جب نومسلم خسرو خاں تخت پر قابض ہوا تو اس وقت بھی نظام الدین اولیاء نے …سادہ رکھی۔ اسی مسلک کو ان کے مرید امیر خسرو نے اختیار کیا۔ انہوں نے بھی ہر سلطان کے دربار میں بلا چون و چرا …ت پیش کیں۔ اس میلان کی نمائندگی مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ان الفاظ سے ہوتی ہے جو انھوں نے …مہ یہ میں لکھے ہیں:-

"روئے زمین کے بادشاہ خدائے بزرگ و برتر کی برگزیدہ مخلوق ہیں، ان کی نافرمانی اور اہانت شرع میں کسی حیلے سے جائز نہیں۔ پس کسی ظاہر و پوشیدہ معاملے میں ان کی مخالفت جائز نہیں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا۔ "جس نے سلطان کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور وہ بخشا گیا۔"

ایک اور جگہ یہی صاحب لکھتے ہیں :۔

"جس نے بادشاہِ وقت کی اطاعت سے انکار کیا وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا مرتکب ہوا۔"

روایت ہے کہ علاؤالدین خلجی نے نظام الدین اولیاء کے سیاسی عزائم کو پرکھنے کے لئے سلطنت کے کسی مسئلے پر ان کی رائے طلب کی۔ انہوں نے جواب میں الٰہی بے نیازی (DIVINE UNCONCERN) کا اظہار کیا اور فرمایا:۔

"فقیروں کو بادشاہوں سے کیا مطلب، میں ایک فقیر ہوں اور شہر سے دُور ایک کونے میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

اس جواب سے علاؤالدین خلجی کو اس جلیل القدر صوفی کی سیاسی لاتعلقی کا اندازہ ہو گیا۔

جب حکمرانوں کو صوفیاء کرام کی سیاسی بیزاری و لاتعلقی کا پختہ یقین ہو گیا تو پھر انہوں نے ان روحانی پیشواؤں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا، سرکاری خزانوں کے مُنہ ان کی خانقاہوں کی تعمیر کے لئے کھول دیئے، ان کی خوشنودی کے حصول کے لئے انہیں قیمتی تحائف بھیجتے رہے۔ سرکاری خزانے سے تعمیر کردہ خانقاہیں صوفیاء کرام کا عوام میں اثر و رسوخ بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ ان خانقاہوں میں صبح و شام لنگر جاری رہتا تھا، ہر خاص و عام کو اپنی روحانی بھوک کے ساتھ جسمانی بھوک مٹانے کی بھی اجازت تھی۔ یہ خانقاہیں بہت جلد صوفیاء کرام کے مختلف سلسلوں کا مرکز بن گئیں، مفت کی روٹی نے اولیاء کرام کے اردگرد مفاد پرست مریدوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا۔ یہ مرید حضرات اپنے جلیل القدر شیوخ کے معاشی تحفظ کیلئے انکی من گھڑت کہانیاں غلو کے ساتھ عوام میں پھیلانے کا ذریعہ بنتے۔ اس طرح وہ اپنی معیشت کو مضبوط کر لیتے تھے۔ اور دوسری طرف ان صوفیاء کرام کے محیر العقول زہد و تقویٰ کے قصے بیان کر کے ان کے گرد تقدس و پاکیزگی کا ہالہ بنا دیتے اور یوں معاشرے میں ان کی عظمت کا سکہ بٹھا دیتے۔

عوام کی عقیدت مندی کو بڑھتا ہوا دیکھ کر اولیاء کرام کے دلوں میں بھی اقتدار کی خواہش نے انگڑائی لی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مسندوں کو دوام بخشنے کے لئے روحانی سلطنت کی بنا ڈالی اور یوں یہ خرقہ پوش عقیدت مندوں کی تعمیر کردہ اس مابعد الطبیعاتی سلطنت کے آمر بن بیٹھے۔ دنیوی ملوکیت کے قیام کے لئے توپ و تفنگ سے کام لینا پڑتا ہے اور جنگ و جدل کے کارزار میں کودنا پڑتا ہے جب کہ روحانی سلطنت آسانی سے قائم ہو جاتی ہے لیکن روحانی سلطنت

کا تسلط چونکہ دلوں پر ہوتا ہے، اس لئے یہ دنیوی سلطنت سے زیادہ پائیدار اور مستحکم ہوتی ہے۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ روحانی سلطنت کوئی اکائی یا وحدت نہیں تھی بلکہ روحانی دنیا اتنی وسیع و عریض تھی کہ اس میں مختلف سلسلوں سے متعلق صوفیاء کرام بیک وقت تخت نشین ہوتے رہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے روحانی سلطنت کے تصور کو مزید تقویت دی۔ انہوں نے فرمایا:۔

"دنیا کے ظاہری نظام کے بالمقابل ایک باطنی و روحانی نظام بھی موجود ہے جو قطبوں، ابدالوں اور اوتاروں کے صدقے قائم ہے۔"

احمد سرہندی کے مریدوں نے انہیں قیوم اوّل قرار دیا۔ قیومیت کے نظریہ کو احمد سرہندی یوں بیان کرتے ہیں:۔

"قیوم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ماتحت تمام اسمائے صفات، شیونات، اعتبارات اور اصول ہوں اور تمام گذشتہ و آئندہ مخلوقات کے عالم، موجودات، انسان، وحوش، پرند، نباتات، ہر ذی روح، پتھر، درخت، بحر و بر کی ہر شے، عرش، کرسی، لوح، قلم، ستارہ، ثوابت، سورج، چاند، آسمان، بروج سب اسی کے سائے میں ہوں، افلاک و بروج کی حرکت و سکون، سمندر کی لہروں کی حرکت، درختوں کے پتوں کا ہلنا، بارش کے قطروں کا گرنا، پھولوں کا پکنا، پرندوں کا چوگ پھیلانا، دن رات کا پیدا ہونا اور گردش زمانہ کی رفتار سب اسی کے حکم سے ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو، زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے وہ اس کے حکم سے ہوتا ہے، کوئی گھڑی، کوئی دن، کوئی ہفتہ، کوئی مہینہ، کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی و بدی کا تصرف کر سکے، غلہ کی پیدائش، نباتات کا اگنا، غرض جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔"

اس اقتباس سے قارئین کرام کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ صوفیاء کرام کے تصرف میں کائناتی قوتیں ہوتی ہیں، ہر مظاہر قدرت اور عمل کائنات ان کے تابع فرمان ہوتا ہے۔

صوفیاء کی روحانی سلطنت کا سربراہ شیخ یا مرشد کہلاتا ہے اور اس کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو سیاسی حکومت کے بادشاہ یا سلطان کی ہوتی ہے۔ مرید کو اپنے شیخ کی غیر مشروط اطاعت کرنا ہوتی ہے، مرید سے اندھی عقیدت مندی کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اسے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے پیشوا یا مرشد سے بڑھ کر کسی کو خدا رسیدہ نہ سمجھے، مرید پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کو تمام ممکنہ محاسن کا مرقع سمجھے اور خواب میں بھی اس کی ذات کے ساتھ کسی بشری ضعف کو منسوب نہ کرے۔ ایک مرتبہ کسی نے حضرت نظام الدین اولیاء سے پوچھا کہ ایک مرید جو پانچ وقت کی

نماز ادا کرتا ہے اور پیر کی محبت دل میں رکھتا ہے جبکہ دوسرا عبادت سے غفلت میں مشغول ہے لیکن اس کا قلب پیر کی یعنی اپنے مرشد کی محبت سے خالی ہے تو ان دونوں میں سے کون زیادہ افضل ہے۔ فرمایا "جو شیخ کا معتقد و محب ہے۔" روحانی و سیاسی سلطنتوں کے ملوک اپنی اپنی ملوکیت کو قائم رکھنے کے لئے ایک جیسے اقدامات کرتے ہیں۔ مثلاً سلطان اپنے حاشیہ نشینوں کو ان کی نمک حلالی کے عوض مناصب، مال و زر اور جاگیروں سے نوازتے ہیں یا یوں کہیئے کہ دنیوی زندگی میں انہیں خوشحال بنادیتے ہیں جبکہ روحانی عمائدین اپنے پیروکاروں کو اُخروی نجات کی ضمانت دیتے ہیں اور انہیں ابدی راحت کا مژدہ سناتے ہیں۔ یہ دونوں ہمنوا ملوک اپنے پیروکاروں سے کامل اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرتے ہیں اور معتقد کی خفیف سی گستاخی اُسے راندۂ درگاہ کردینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

روحانی سلطنت کے فروغ اور شیخ و مُرشد سے والہانہ لگاؤ شیوخ میں انانیت پیدا کرنے کا سبب بنا۔ وہ اپنے آپ کو سلطانوں اور حکمرانوں سے افضل و برتر سمجھنے لگے۔ یہ عقیدہ معاشرے میں جڑ پکڑنے لگا کہ دنیاوی بادشاہت اور شان و شوکت بھی ان پیروں اور صوفیاء کرام کے فیضانِ نظر سے ملتی ہے۔ احمد سرہندی رسالہ تہلیلہ میں رقمطراز ہیں:۔

> "وہ صوفیاء کرام جو خدا پرست، صاحبِ کشف اور شمع نبوت سے نور حاصل کرتے ہیں زمین ان کے سہارے قائم ہے اور انہیں کے فیض و برکت سے اہل زمین پر نزولِ رحمت ہوتا ہے اور انہیں کی وجہ سے لوگوں پر بارش برسائی جاتی ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔"

سلاطین دہلی کے متعلق اس قسم کی روایات معروف ہیں کہ انہیں ہندوستان کی سلطنت کسی صوفی یا پیر کی دُعا کے نتیجے میں ملی۔ مثلاً التمش، چشتی، فرید الدین گنج شکر اور نظام الدین اولیاء کی پیش گوئیاں تھیں جن کی وجہ سے یہ سلاطین سرفراز ہوئے۔

اس طرح سلطان کی سیاسی کامیابیاں، فتوحات اور ملک کی فارغ البالی سب صوفیاء کرام کی نگاہِ کرم کا نتیجہ قرار دی جاتی ہیں۔ صوفیاء کرام کا نفسیاتی تسلط حکمرانوں پر گہرا کرنے کے لئے یہ عقائد پھیلائے گئے کہ محمود غزنوی کی فتوحات خواجہ ابو محمد چشتی، شہاب الدین غوری کی فتح و کامرانی، اسی طرح معین الدین چشتی اور علاؤ الدین خلجی کی فتوحات نظام الدین اولیاء کی کرامات کا کرشمہ تھیں۔ اسی طرح مغلوں کی فتح ہندی اور غلبہ غوث گوالیاری کے روحانی فیض کے سبب تھا۔ ان عقائد کا اثر یہ ہوا کہ سلاطین نے اپنی سیاسی بقاء کے لئے صوفیاء کرام کی رضا جوئی میں عافیت سمجھی اور ان کی نافرمانی سے مجتنب رہنے لگے۔ مثال کے طور پر نظام الدین اولیاء سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ غیاث الدین تغلق نے جب بنگال سے واپسی پر انہیں کہلا بھیجا کہ وہ اس کی آمد تک دلی سے منتقل ہو جائیں انہوں نے کہا "ہنوز دلّی دور است"۔ اور اس درویشانہ صدرت کی تاب نہ لاتے ہوئے سلطان دلّی سے باہر ہی لقمۂ اجل

بن گئے۔ اس طرح روحانی ملوکیت کی جڑیں آہستہ آہستہ بہت مضبوط ہو گئیں۔

روحانی سلطنت کے ادارے کو دوام بخشنے کے لئے رسمِ بیعت کا اجراء کیا گیا۔ مرید بننے کے لئے "بیعت" ناگزیر تھی۔ رسمِ بیعت سے مفہوم یہ تھا کہ مرید اب کاملاً اپنے مرشد کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو گیا ہے۔ اسے اب اپنی زندگی کے ہر مسئلے میں اپنے مرشد سے رجوع کرنا ہوگا۔ مرید کے لئے مرشد کی شخصیت فیصلہ کن اتھارٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس طرح بیعت کے ذریعے ایک آزاد شخص کو پابند کر لیا جاتا ہے۔ بیعت کے وقت مختلف سلسلے، مختلف رسوم ادا کئے جاتے ہیں۔ مثلاً چشتیہ سلسلہ میں بیعت کے وقت مرید کے کان کے قریب سے تھوڑے سے بال کاٹ دیئے جاتے ہیں اور مرید کو سلسلہ کی ٹوپی پہنائی جاتی ہے۔ پس یوں مرید کی گردن میں غلامی کا پٹا ڈال دیا جاتا ہے۔

کتبِ تاریخ اور ملفوظات کے مطالعہ سے ہمیں سیاسی دربار اور روحانی دربار میں خاصی مماثلت نظر آتی ہے۔ روحانی دربار اور سیاسی دربار کے آداب و رسوم بھی ملتے جلتے ہیں۔ شیخ یعنی مرشدِ کامل سب سے رفیع اور ممتاز مسند پر جلوہ افروز ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے بادشاہِ وقت اپنے دربار میں تخت نشین ہوتا تھا۔ مجلس میں داخل ہوتے وقت مرشد کے ہاتھ پاؤں یا آستین چومنا اور بعض حالات میں سجدہ کرنا بھی لازم قرار دیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ نظام الدین اولیاء کا روحانی فیوض سے معمور دربار سجا ہوا تھا اور مرید انہیں سجدے کر کے خاک نشین ہوتے جا رہے تھے، دریں اثناء ایک نوارد جو شام یا روم سے آیا تھا، اس نے مریدوں کو شیخ مکرم کے سامنے سجدہ کرنے سے منع کیا۔ اس پر نظام الدین اولیاء سیخ پا ہو گئے اور یہ توجیہہ پیش کی کہ سابقہ امتیں بھی اپنے بادشاہ اور پیغمبروں کو سجدہ کیا کرتی تھیں، بے شک حضورؐ کی آمد کے بعد سوائے خدا کے کسی اور کو سجدہ روا نہیں، تحیتہ سجدہ نہیں رہا لیکن یہ اب بھی مباح ہے اور مباح کو روکنا قطعی غیر شرعی ہے۔ روحانی مجالس کے آداب میں یہ شامل تھا کہ کسی سے بات نہ کی جائے، نگاہیں جھکی رہیں، دائیں بائیں نہ دیکھیں [illegible]۔

مرشد سے بات کرتے وقت اس سے آنکھیں ملانا گستاخی سمجھی جاتی ہے۔ ہاں البتہ مرشد حاکمِ وقت کی آمد پر اپنی مسند سے اٹھ کر انہیں خوش آمدید کہتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ بادشاہوں کی طرح ان روحانی بزرگوں کے بھی کئی ملازم اور خادم ہوتے ہیں جن کے فرائض میں مرشد کو وضو کرانا، مصلّٰی کی خدمت سنبھالنا اور ان کے کھانے اور کپڑوں وغیرہ کی نگہداشت شامل ہے۔

بادشاہوں کے حالاتِ زندگی تحریر کرنے والے مورخین لکھتے رہے ہیں جبکہ اولیاء کرام کے حالاتِ زندگی ان کے مرید لکھتے ہیں جو ملفوظات کے نام سے شہرت پاتے ہیں۔ ان ملفوظات میں مرشدین کامل کے روحانی عجائبات و کرامات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان روحانی بادشاہوں کی [illegible] تنویمی نیند سے کبھی بیدار نہ ہو سکیں۔ مرشد اپنے وصال سے قبل اپنا جانشین مقرر کرتا ہے تاکہ اس کی عدم موجودگی میں وہ اس کے سلسلے کو جاری رکھ سکے۔ جانشین

بنانے کی رسم کو اصطلاحاً سجادہ نشینی کہا جاتا ہے۔ اس رسم کو رسمِ تاجپوشی سے گہری مماثلت ہے کیونکہ اس رسم کے بعد اس مرید کا درجہ شیخ یا مرشد کے برابر ہو جاتا تھا اور وہ مطیع سے واجب الاطاعات بن جاتا ہے۔ جانشینی کے وقت جانشین کو مرشد کی جانب سے خاص خاص چیزیں بطور علامت عطا کی جاتی ہیں جیسے سجادہ، خرقہ، دستار، کھڑاؤں، عصا، قمیض، چادر وغیرہ۔ خواجہ معین الدین چشتی نے جب قطب الدین بختیار کاکی کو خلافت عطا فرمائی اور اپنا جانشین بنایا تو ان کے سر پر دستار باندھی، زرہ پہنائی اور اپنے مرشد کا مصلّٰے اور قرآن انہیں دیا۔ نظام الدین اولیاء نے اپنے جانشین و خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کو خرقہ، عصا، مصلّٰے، تسبیح اور لکڑی کا پیالہ دیا جو انہیں اپنے مرشد فرید الدین گنج شکر سے ملا تھا۔

خلیفہ کا تقرر تین طریقوں سے کیا جاتا ہے:۔

۱۔ خدا کی طرف سے الہام ہو کہ فلاں مرید کو خلیفہ بناؤ۔

۲۔ شیخ خود اپنے کسی ممتاز مرید کو خلیفہ منتخب کر لیتا ہے۔

۳۔ مرید خود اپنی تقرری کے لئے شیخ سے سفارش کرتا۔ خلیفہ بننے کے بعد مرید کو "خلافت نامہ" عطا کیا جاتا ہے جس کی رُو سے اسے مزید خلیفہ بنانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے مقررہ علاقے کا چارج سنبھال لیتا ہے۔ شیخ یا مرشد امیدوارِ خلافت کو پُرشکوہ خطابات سے بھی نوازتے تھے جیسے سلطانِ اولیاء محبوبِ سبحانی، غوث الاعظم، پیرانِ پیر عبد القادر جیلانی، شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ المشائخ ضیاء محی الدین، سلطان کشور کشائے ولایت و کرامت خواجہ معین الدین حسن چشتی، قطب المشائخ خداوند خلافتِ عظمٰے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ حمید سلطان التارکین وغیرہ۔ ان پُرجلال خطابات سے سادہ لوح عوام کے قلوب پر ان روحانی ہستیوں کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

ملوکیت تو سوائے چند ایک مسلم ممالک کے دنیائے سیاست میں معدوم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ عوام کا سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے اور وہ اپنے بنیادی حق یعنی فکر و عمل کی آزادی کی بازیافت کے لئے میدانِ عمل میں نکل آئے ہیں۔ روحانی ملوکیت البتہ آج بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ روحانی سلطنت کا قیام چونکہ قلب پر واقع ہوتا ہے اس لئے یہ آج بھی اسی طرح مستحکم اور اٹل ہے۔ سادہ لوح عوام آج بھی اپنی آزادی کو ان روحانی پیشواؤں کے ہاتھوں فروخت کر رہے ہیں۔ لطف یہ کہ معاشی انحطاط (ECONOMIC RECESSION) کے اس دور میں روحانی پیشواؤں کی معیشت نہ صرف یہ کہ پائیدار ہے بلکہ مزید مستحکم ہو رہی ہے اور کوئی خطرہ لاحق نہیں۔

اندریں حالات مجھے یہ کہنے میں ذرا بھر باک نہیں کہ سیاسی آزادی کے باوجود انسانی آزادیٔ فکر و نظر کا خواب

اس وقت تک شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا جب تک شہنشاہیت کی دوسری قسم روحانی ملوکیت انسانی ذہنوں پر مسلط ہے۔ لہٰذا انسان کو بحیثیت انسان اگر طلوع ہونا ہے تو روحانی ملوکیت کے اس غیر محسوس مگر مہیب خوف سے بھی نجات حاصل کرنا ہوگی۔ اور اس کے لیے درکار ہے فقط ایک سجدہ جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے آدمی کو دیتا ہے نجات

اور اس کے بعد اگر کوئی ایک مسلمان کی زندگی جینا چاہتا ہے تو سُن لے کہ

نیست ممکن جز بقرآں زیست

طلوعِ اسلام ـــــ ایک ماہوار رسالہ ہی نہیں۔ یہ ایک تحریک کا نقیب ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ اس مملکتِ پاکستان میں وہ صحیح اسلامی نظام متشکل ہو جائے جو عہدِ رسالتمآبؐ اور خلفائے راشدینؓ میں وجۂ شادابیٔ عالم ہوا تھا۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں اسلامی نظام کا صحیح تصور راسخ ہو جائے۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر، ماہنامہ طلوعِ اسلام۔ پرویز صاحبؒ کے خطابات، ان کا ہفتہ وار درسِ قرآنِ کریم اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ طلوعِ اسلام عملی سیاسیات میں حصّہ نہیں لیتا، نہ ہی اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے ہے۔ اس کا مقصد قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے۔ اگر آپ اس مقصد سے متفق ہوں تو اس کے ساتھ تعاون فرمایئے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام بی/۲۵۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ہیں آج کیوں ذلیل

آج دنیا میں ہر طرف ترقی کا شور ہے، سب کہہ رہے ہیں انسان نے بہت ترقی کر لی ہے، تاروں پہ کمندیں پھینکنے، مہتاب پہ شب خوں، ستاروں کی گزرگاہوں کی سیر اب شاعرانہ تعلی نہیں، حقیقت بن کر سامنے آچکی۔ کل تک جو بات ناممکن دکھائی دیتی تھی آج وہ روزمرہ کے معمولات میں شامل ہے، ریڈیو، ٹی وی، سیٹلائیٹ کے ذریعے رابطے کل تک کس کا ذہن انہیں حقیقت مان سکتا تھا، روبوٹ اور کمپیوٹر کے کمالات تو آج کے تیسری دنیا کے پڑھے لکھوں کو حیران کر دینے کو کافی ہیں۔

اور یہ سائنسی کمالات ایک میدان میں نہیں، طب کے میدان میں سائنس کی اس ترقی نے شفا کے نئے باب کھول دیئے ہیں، ایکسرے، الٹراساؤنڈ، ایکوکارڈیوگرافی، اینجیوگرافی، برقی لہروں کے زور پہ جسم پر نشتر لگائے بغیر پتھریوں کا اخراج، کورنیا کی تبدیلی ہی نہیں گردوں کی تبدیلی، حتیٰ کہ دل کی تبدیلی اس دور کی شعبدہ بازی اور معجزہ نمائی ہی کہی جا سکتی ہے۔

موروثی بیماریوں کا قبل از وقت ادراک جینیٹکس کی سائنس نے ممکن کر دکھایا ہے۔

انسانی زندگی ہی نہیں، نباتات کی دنیا میں، زیر زمین چھپے خزانوں کی تلاش میں ہر طرف اس ترقی کے مظاہر دیکھے جا رہے ہیں مگر اس ترقی کے کچھ منفی پہلو بھی ہیں۔

نئی ادویات اور تکنیک نے جہاں کچھ پرانی بیماریوں کو ختم کر دیا وہاں نئی بیماریوں کا چیلنج انسانیت کو درپیش ہے، چیچک، تپ دق، جذام کنٹرول ہو گئے، تو کینسر کا دیو منہ کھولے کھڑا ہے، ایڈز عالمگیر مسئلہ بن رہا ہے۔

اس ترقی نے تباہی کے نئے باب کھولے، ہیروشیما، ناگاساکی قصۂ پارینہ ہو چکا مگر ابھی تک نسلِ انسانی اس کے مضر اثرات سے باہر نہیں نکل سکی۔

جن ہاتھوں نے ناگاساکی، ہیروشیما کی داستان رقم کی، وہ اب بھی سلامت ہیں اور اپنے کیے پہ شرمندہ بھی نہیں

وہ آج بھی اپنے ان اعمال کی تاویلیں پیش کر رہے ہیں، آج بھی ان کا وجود اور ان کے ارادے دنیا کے ان گنت انسانوں کے لئے ایک بھیانک خواب کی طرح ارد گرد منڈلا رہے ہیں، ہلاکو اور چنگیز کے ہاتھوں لائی تباہیاں آج کے ٹرومینوں اور بشوں کے ہاتھوں ممکن ہلاکت آفرینیوں کے سامنے خجل اور سرنگوں ہیں، شاید یہ انہی کی روحیں نئے پیکروں میں نمودار ہو رہی ہیں۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اگر پہلے آپ نے اس پر غور نہیں کیا تو اب اس پر غور کیجئے، کیا سائنس کی اس ترقی کو انسان کی ترقی کہا جا سکتا ہے

اس ضمن میں سوال بھی سامنے آئے گا کہ ترقی کسے کہتے ہیں، انسان کیا ہوتا ہے؟

کیا سائنسی ترقی میں سرفہرست ممالک میں انسان سکھ چین میں ہے، کیا ان ممالک میں امن و آشتی کا دور دورہ ہے، وہ جن کے ایسٹرونائٹس خلا میں سیر کرتے ہیں، چاند پہ چہل قدمی کر چکے ہیں، ان کے ملک انہی جیسے انسانوں کے لئے راحت کدے بن چکے ہیں، کیا وہاں اب لوگ فٹ پاتھوں پر نہیں سوتے، وہاں پر غریب بستیاں SLUM AREAS ختم ہو چکے ہیں، محرومی اور جرائم کے باب بند ہو چکے،

سوویت یونین کا بھید تو کھل چکا، چاند اور خلاؤں کی سیر کرنے والوں کے ملک میں اقتصادی بدحالی نے لوگوں کو اس حد تک مجبور کر دیا کہ انہوں نے سارے نظام ہی کو تہہ و بالا کر دیا، لاکھوں کروڑوں انسانوں کو کلاشنکوف تھما کر انہیں درندوں میں ڈھال دینے والا اس کا موجد اپنے لئے سامانِ عیش و عشرت تو کیا سامانِ ضرورت بھی مہیا نہ کر سکا، یونین بکھر چکی، ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے ذخیرے اسے نہ روک سکے، آزاد ریاستوں کی کامن ویلتھ ایک سراب ہے جس میں نہ کچھ کامن (مشترک) ہے اور نہ ویلتھ (دولت) نام کی کوئی شے، گورباچوف ناکام و نامراد ہو چکا، یلسن کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہے اور در بدر کی خاک ہے، وہ کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جا رہا ہے لیکن جرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔

امریکہ بہادر کی خوشحالی بھی سراب ہے، خلیج کی جنگ سے پہلے بنک پہ بنک فیل ہو رہا تھا، تیل پیدا کرنے والے علاقے میں جنگ کروا کر کمالِ عیاری سے اس نے اپنی معیشت کو سہارا دیا، عربوں سے اپنی خدمات کے عوض دولت بھی کمائی اور تیل کے منبعوں پہ اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ لئے۔

مگر امریکہ کے SLUM AREAS کسی سے ڈھکے چھپے نہیں، وہاں پرورش پانے والی فراواں مخلوق اور اخلاقی انحطاط کی جن پستیوں کو چھو رہی ہے اس کا نظارہ دنیا نے ان چند گھنٹوں میں کر لیا جب نیویارک بجلی فیل ہونے کی وجہ سے تاریکی میں ڈوب گیا مگر یہ تاریکی صرف برقی رَو کا تعطل نہیں تھا بلکہ اخلاقی انحطاط اور جرم

کے رجحان کی تاریکی تھی، ان چند گھنٹوں میں جو کچھ نیویارک میں ہوا مغربی تہذیب کے سب سے متمول مہذب اور ترقی یافتہ ملک کے چہرے کو صدیوں نہیں تو سالوں کالا کر دینے کو کافی ہے۔

گوروں اور کالوں کے لئے الگ معیارِ انصاف کا مظاہرہ بھی کل کی بات ہے جب صدر امریکہ کو امن و امان بحال کرنے کے لئے فوج کی مدد لینی پڑی،

جنوبی افریقہ میں یہ امتیاز اپنی انتہا پہ ہے اور ساری مہذب دنیا، نہ صرف اسے برداشت کر رہی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے، امتیازی سلوک کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

قذافی کے گھر پہ ہوائی حملے کا میں ذکر نہیں کروں گا کہ اس میں مرنے والی ایک معصوم بچی تھی مگر اس دنیا کی سب سے اونچی انجمن کے ایک ملک پر تیس ملکوں کی بے دریغ اندھا دھند بمباری کی اجازت بلکہ شہر جس میں بے شمار بے گناہ شہری ـــــ بچے بوڑھے، عورتیں مارے گئے اسے تہذیب کہیں گے، ترقی یا کچھ اور ـــــ

سچی بات تو یہ ہے کہ آج تک انسان نے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، کبھی انجمن اقوامِ متحدہ کا اجلاس اس مقصد پہ غور کرنے کے لئے بلایا گیا ہے کہ دنیا کے دانش ور اس بات پہ سوچیں کہ اس کرۂ ارض پہ انسان کے قیام کا مقصد کیا ہے بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے ـــــ کیا یہ سب کائنات اور انسان بلا مقصد وجود میں آ گئے تھے، اگر نہیں، اس کی تخلیق کا کچھ مقصد تھا تو کیا تاریخ کے اس سفر میں انسان نے اس مقصد کے حصول کے لئے کچھ کیا ہے، اس طرف کوئی قدم اٹھائے ہیں!

مشکل یہ ہے کہ انسان کی سوچ ابھی اقوامِ متحدہ کی سطح تک پہنچ سکی ہے، نہ جنگیں ختم ہوئی ہیں نہ منافرتیں کم ہوئی ہیں ـــــ افسوس کہ وہ آج بھی جمعیت اقوام اور جمعیت آدم کے باریک فرق کو نہیں سمجھ سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج تک انسان نے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، آج بھی سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ خود کو، اپنی تخلیق کے مقصد کو سمجھے، اگر وہ یہ نہ کر سکا تو یہ ساری ترقی اس کے لئے دردِ سر اور سوہانِ روح بنتی جائے گی، تنہا عقل، سائنس کی ترقی اسے خلاؤں میں تو گھما سکتی ہے، شاید دوسرے کرّوں تک بھی لے جائے، یہ وہاں آبادیاں قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے، مگر وہاں بھی یہ نو آبادیاں ہی بنائے گا، وہی اونچ نیچ وہی استحصال ـــــ اس ترقی کے صدقے، تخلیقِ آدم میں فرشتوں کا اعتراض "فساد فی الارض" فساد فی الکائنات کی شکل اختیار کر سکتا ہے اسے سائنس کی ترقی تو کہا جا سکتا ہے انسانیت کی ترقی نہیں، ظلم کو، استحصال کو، فساد کو ترقی تو نہیں کہا جا سکتا۔

آج کے بظاہر ترقی یافتہ انسان کو ماننا پڑے گا اور جتنی جلدی وہ یہ مان لے اس کے لئے، خلقِ خدا کے لئے، کائنات کے لئے خوش آئند ہو گا کہ انسان ایک جانور یا ایک مشین نہیں، اس کا ایک جسم ضرور ہے، اس کے جسم کے تقاضے بھی ہیں، ان کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے، سفر کے لئے سواری کا خیال رکھنا بھی ذمہ داری ہے مگر اس کو منتہا

نہیں بنایا جا سکتا، منزل کا تعین اور اس سمت سفر سواری کا کام ہے، سہولتوں اور خواہشوں کا غلام بننا منزل سے غافل کر سکتا ہے، ان سے بھاگنا اور انہیں مارنا بھی نجات کا ذریعہ نہیں، خواہشات تو دریا کی بہتی ہوئی موجوں کی مانند ہیں، پانی اچھل کر ارد گرد پھیل جائے، راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جائے تو دریا کو کوسنا اس کا علاج نہیں، اسے یکسر خشک کر دینا بھی اس کا علاج نہیں، اسے حدوں کے اندر، کناروں کے اندر رکھنا ہے، پھر جو اس سے نہریں نکلیں گی وہ کھیتیاں لہلہائیں گی ـــــ دنیا کا سارا ادب، سارا فن، ساری مصوری، ساری موسیقی، ساری تعمیر اپنی ابلتی ہوئی خواہشوں کو نئی راہ پہ ڈالنے کا نام ہے، یہ نہ ہوتیں تو یہ دنیا کسی سادھو کی کٹیا ہوتی یا یونان و روما کے بازاروں کی نمائش گاہیں۔

جس دن انسان نے یہ تسلیم کر لیا کہ وہ صرف جسم نہیں اور جسم کی موت کے ساتھ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا، زندگی کی جوئے رواں کا انجام موت نہیں، اس کی راہ میں محض ایک موڑ ہے، جسم کی موت کے بعد اس کی خودی اپنے اندر تمام اعمال کے اثرات لئے اگلے سفر پہ نکل پڑتی ہے، ہوائی جہاز کے بلیک بوکس کی طرح زندگی کے ہر ہر لمحے کا ریکارڈ اس پر ثبت ہے ـــــ

اختیار اور ارادے نے اسے جو آزادی دی تھی وہ اس کے لئے ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی وہ اپنے اعمال کے لئے ایک برتر ذات کے سامنے جوابدہ ہے جس نے اسے یہ زندگی دی، اختیار و ارادہ دیا اور زندگی کی شاہراہوں پہ سفر کو محفوظ اور درست سمت میں رکھنے کے لئے نشاناتِ راہ دکھائے ـــــ اسے ایک ہدایت نامہ بھی دیا جو اس کی ذات کی تعمیر اور تکمیل کی رہنمائی کا اہتمام ہے، یہ ہدایت نامہ یہ رہنمائی اس وحی میں محفوظ ہے جو آخری بار نبی آخر الزماں کی وساطت سے دنیا میں آئی اور ابد تک کے لئے محفوظ کر دی گئی ـــــ اس کے تحت اسے اختیار ہے کہ وہ خالق کائنات کے قانون کو مانے یا اس سے انکار کر دے، یہ وہ اختیار ہے جو اور کسی کو حاصل نہیں، یہ بڑے بڑے کرّے یہ چاند، سورج، یہ کہکشاں سب اس کے قانون کی ڈور میں بندھے ہیں، سورج کے اختیار میں نہیں کہ مقررہ وقت پہ نہ نکلے زمین کو اختیار نہیں کہ اپنے مدار سے باہر نکل سکے ـــــ مگر اس اختیار کے ساتھ یہ انسان کو مجبوری بھی لاحق ہے کہ اعمال کا نتیجہ وہ تبدیل نہیں کر سکتا، مکافاتِ عمل سے وہ بچ نہیں سکتا، اس کے اعمال اور کائنات کی گردش کا آپس میں کیا تعلق ہے یہ سائنس حل نہیں کر سکی، سائنس عقل سے بلند تر کسی ذریعۂ علم کو تسلیم نہیں کرتی، یہی وجہ ہے کہ وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے، وہ انسانوں کو جینے کا ڈھنگ نہیں سکھا سکی، اس کے بل بوتے انسانیت کا سفر یوں لگتا ہے بھلائی کی مخالف سمت کا سفر ہے، یہ سفر تو امن، سلامتی، ایکتا اور مساوات کی طرف ہونا چاہیئے، اس کی منزل تو وہ فردوس گم گشتہ ہے جہاں نہ بھوک ہے نہ پیاس، نہ احتیاج، نہ بے گھری، نہ بے دری، نہ خوف، نہ حزن۔

عقل کی رہنمائی میں چلنے والا قافلہ بھی گرتا پڑتا LIBERTY FRATEINITY EQUALITY کے سنگ میل

تک آیا مگر مفاد خویش نے اسے پھر بھٹکا دیا، انقلاب فرانس سے انقلاب روس تک کا سفر پھر وہی اعصاب شکن روح فرسا سفر ہے ـــــ اور اس سے آگے شکست وریخت کی منزل ہے، سوویت یونین کے حصے بخرے ہوئے تو گیارہ متحارب مفادات کے حامل ملک وجود میں آ گئے، چیکوسلواکیہ جسے ہم ایک لفظ سمجھتے آ رہے تھے آج چیک اور سلوواک مملکتوں میں تقسیم ہو چکا ہے، یوگوسلاویہ، سلاویا، کروشیا، بوسنیا، مقدونیہ میں بٹتا دکھائی دے رہا ہے ـــ المیہ یہ ہے کہ یہ محض بٹ ہی نہیں رہے باہم دست وگریباں ہیں ـــــ

کیا یہ تقسیم، یہ مشاجرت کا سفر مثبت سمت میں سفر ہے، کیا انسانیت کی ترقی کی معراج بٹنے میں، ٹکڑے ٹکڑے ہونے میں ہے ـــــ عقل بھی ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر غور کرے گی تو اسی نتیجے میں پہنچے گی یہ مثبت نہیں منفی سمت کا سفر ہے مگر وہ بے بس ہے ـــــ

وحی نے صدیوں پہلے اس بات کی نشاندہی کر دی تھی کہ یہ ساری نسل انسانی، ساری انسانیت ایک امت ہے، کان الناس امۃ واحدۃ مشاجرت کی داستان ہبوط آدم کی داستان ہے، فردوس کی گم گشتگی کی کہانی ہے اور پریشان حال آدم کو اس فردوس گم گشتہ کا راستہ بتانے والے ہمیشہ دلوں کو جوڑنے دشمنوں کو دوست بنانے، بکھرے ہوؤں کو اکٹھا کرنے کا پیغام لے کر آتے رہے ہیں ـــــ

اس وقت ساری بظاہر ترقی یافتہ دنیا وحی کی روشنی سے محروم ہے اور اس طرح بھٹکنا اس کا مقدر ہے۔

یہ کام وہی جمعیت، وہی قوم، وہی امت کر سکتی ہے جو اپنے پیدا کرنے والے کی دی ہوئی ہدایت پر یقین رکھتی ہو، اس کے مطابق اس کے نظام ربوبیت پر مبنی مساوات انسانیہ پر مبنی معاشرے کی تشکیل کرے، ہر بچہ یکساں واجب التکریم ہو، معاشرے کی ذمہ داری ہو کہ ہر ایک کو یکساں مواقع بہم پہنچائے تاکہ ہر بچہ اپنے اندر مضمر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکے، نہ ذات پات، نہ معاشی ناہمواری، نہ نسلی تفاخر راستے میں حائل ہو ـــــ

یہ خطۂ زمین، پاکستان حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا تھا، لیکن کس قدر دکھ کی بات ہے کہ آج پاکستان نسل، زبان اور علاقائی عصبیتوں ہی کا نہیں متحارب مذہبی فرقوں میں بٹا ہوا ایک ملک نظر آ رہا ہے، صدیوں کی طرح فرقے بھی سرکاری اور آئینی طور پر تسلیم شدہ گروہ ہیں ـــــ

اس حال میں یہ امت کیا منہ لے کر دنیا کو وحدت کا، دوستی کا، امن کا، سلامتی کا، اسلام کا پیغام دے سکتی ہے، خود صوبائی اور نسلی منافرت میں مبتلا، فرقوں میں بٹے ہوئے کیسے دنیا کو ملکی سرحدوں سے اوپر سر اٹھا کر وحدت انسانیہ کا سبق دے سکتے ہیں، ہمیں تو پہلے خود اتحاد کی راہ اپنانا ہوگی۔

یاد رکھیے جس خدا نے اتحاد کو، دلوں کو جوڑنے کو اپنی نعمت کہا ہے اسی خدا نے اس کا راستہ بھی بتا دیا ہے، اس کا

فارمولا بھی بتا دیا ہے،

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا

یہی ایک راستہ ہے اتحاد کا ـــــ قرآن اور صرف قرآن کی طرف رہنمائی کے لئے رجوع کرنا، یہی بکھرے ہوئے فرقوں کو فرقوں کی بندشوں سے اوپر اُٹھ کر ایک امت بننے کا فارمولا ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

یہی امت جب تسخیرِ کائنات کرے گی تو اس کے ماحصل کو اپنے محدود مفاد کے لئے نہیں ساری انسانیت کے لئے کھلا رکھے گی، مقامِ مومن مقامِ آدم سے یہی ایک قدم آگے ہے جو اسے وہ وسعتِ قلب عطا کرتی ہے کہ سب کے لئے سوچ سکے ـــــ وہ صرف وحی کے تابع ہے اور وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ، انسانیت ایسی ہی امت کے طفیل امن و سلامتی کے حصار میں آکر فردوسِ گم گشتہ پا سکتی ہے اور فرشتوں کے اعتراض کے بعد اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تفسیر بن سکتی ہے جب اس ذاتِ باری نے فرمایا تھا کہ:

تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔

جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔ حضرت عمرؓ

ثریا عندلیب

دستک

یوں تو اپنے معلّم مشفق مفکرِ قرآن جناب پرویز علیہ الرحمہ کی بصیرت افروز یاد ہمہ وقت قلب و ذہن کی رفیق رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ۹ جولائی کی تاریخ اس یاد کو دوچند کر دیتی ہے۔ ہم آپ جانتے ہیں کہ ۹ جولائی ہمارے نابغۂ روزگار بابا جیؒ کی پیدائش کی تاریخ ہے اور عظیم انسانوں کی پیدائش کی تاریخ اور دن کبھی بھولتا ہے نہ بھلایا جا سکتا ہے کہ اس تاریخ اور اس دن کی عظمت و برکت اس انسان کی عظمت و برکت سے وابستہ ہونے پر ہمیشہ ضوفشاں رہتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس خوشگوار و دل نواز موقع پر بابا جیؒ کی فکرِ قرآنی اور بصیرتِ فرقانی کے تابندہ نقوش سے اپنی انسانی زندگی کے لئے روشنی حاصل نہ کرنا اپنے ساتھ صریحاً ناانصافی اور زیادتی کرنا ہوگا۔ چنانچہ آج میں اس منفرد مفکرِ قرآن کے پیش کردہ نہایت اہم حقائق میں سے چند ایک وہ حقیقتیں اپنے قارئینِ طلوعِ اسلام کے سامنے لانا چاہتی ہوں جن کی طرف سے بالخصوص ہم پاکستانی مسلمانوں نے بالکل رُخ پھیر رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانیت سے مُنہ پھیر رکھا ہے۔ جن کو بھلا کر گویا ہم نے اپنے آپ کو بھلا دیا ہے۔ اس کے باوجود تاریکی سے روشنی کی طرف آنا کچھ مشکل نہیں، صرف پہلا قدم اٹھانے کی دیر ہے۔ اور بابا جی مردِ حق شناس کی تاریخ پیدائش کی راحت بخش یاد کے حوالے سے یہی تو وہ مبارک موقع ہے جب ہم اپنی دنیا بدلنے کا آغاز کر سکتے اور بابا جیؒ کے حسنِ تفکر کے ثمرات سے اپنے دامن بھر سکتے ہیں۔

انسانی نشوونما انسان کی بنیادی اور ناگزیر ضرورت ہے۔ اس بارے میں استادِ مکرم جناب پرویز مرحوم نے رقوم کیا۔

> "حیوان کے بچے کی طبعی ضروریات پوری ہوتی رہیں تو وہ ازخود وہی کچھ بن جاتا ہے جو کچھ اسے بننا ہوتا ہے لیکن اگر کسی انسانی بچہ کی بھی صرف طبعی ضروریات ہی کی فکر کی جائے تو بڑا ہو کر حیوان تو بن جائے گا انسان نہیں بن سکے گا۔ انسان تو بنانے سے بنتا ہے ازخود نہیں بنتا۔"

ذرا غور کیجئے! اس بلیغ نقطہ پر کہ "انسان تو بنانے سے بنتا ہے از خود نہیں بنتا۔" بچے کو انسان بنانے کی اوّلین ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے! کیا ہم والدین ذی احترام پر نہیں؟ استادانِ عالی مقام پر نہیں؟ ہوتی ہے، یقیناً ہوتی ہے! کیا ہم نے اسے پورا کیا! یا کر رہے ہیں؟ اس کا جواب ہماری نئی نسل کی شکل میں موجود ہے۔ یہاں بابا جیؒ کہتے ہیں کہ "یہ نوجوان خود ہمارے پیدا کردہ ہیں، یہ وہی کچھ بنے ہیں جو کچھ ہم نے انہیں بنایا ہے، یہ ہماری اپنی بوئی ہوئی فصل ہے جو اب پروان چڑھ رہی ہے۔" اپنے آپ سے پوچھئے۔ کیا ہم نے خود انسانی اقدارِ حیات اپنا کر اپنے بچوں کو ان سے آشنا کیا؟ اس دیدہ ور نے لکھا ہے۔

> "جو انسان انسانی اقدار سے آشنا نہ ہو اسے انسان کہنا انسانیت کی توہین تو ہے ہی اسے حیوان کہنا بھی حیوانیت کی تذلیل ہے۔ اس لئے کہ حیوان اگر انسانی اقدار سے شناسا نہیں ہوتا، تو وہ جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی، دھوکہ دہی وغیرہ سے بھی تو آشنا نہیں ہوتا۔ اسی لئے تو قرآن نے ایسے انسانوں کو حیوانات کے مقابلے میں بَلْ هُمْ اَضَلّ کہا ہے یعنی ان سے بھی گئے گزرے۔"

ہم والدین کی انتہائی غفلت کے شکار یہ بچے نوعمر لڑکے لڑکیاں جب آج کی تعلیم گاہوں میں پہنچتے ہیں تو رہی سہی کسر پوری ہو جاتی ہے۔ بابا جیؒ نے اس بارے میں آج سے چوبیس سال پہلے جن تلخ حقائق کی نشاندہی کی تھی صد حیف کہ ان پر توجہ نہ دی گئی اور اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی ہمارے شعبۂ تعلیم کی وہی بدحالی ہے جو قیامِ پاکستان کے آغاز میں تھی۔ آج بھی طلبا و طالبات اسی بلکہ کئی حوالوں سے اس سے دس بیس گنا بڑھ کر ناہمواریوں سے دوچار ہیں اور بحرانوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے معلّم راہ دان نے لکھا تھا۔

> "کسی زمانے میں استاد اور شاگرد کا رشتہ عجیب و غریب رشتہ ہوتا تھا۔ استاد روحانی باپ ہوتا تھا اور شاگرد اس کی معنوی اولاد۔ ہم نے اپنے عہدِ غلامی میں جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ہے مسلمان تو ایک طرف، ان میں سے غیر مسلم اساتذہ کی بھی یہ کیفیت تھی کہ وہ پاکستان سے چلے گئے ہیں۔ لیکن اپنے شاگردوں کے ساتھ اسی "باپ اور اولاد" کے رشتے کو ابھی تک قائم رکھے ہوئے ہیں ـــــ ان سے اگر کسی وقت بھی ملنے کا اتفاق ہو تو استاد کی نظروں میں وہی شفقت اور شاگرد کی نگاہوں میں وہی احترام ملے گا۔ اس احترام کی بنیاد کیا تھی؟ استاد کا ذاتی کردار (کیریکٹر)۔ یاد رکھئے! احترام صرف پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار کے ردِّ عمل کا نام ہے اور آج یہ متاع ہماری درس گاہوں میں مفقود ہے (الّا ماشاء اللہ)۔"

کیا یہ افسوسناک حقیقت نہیں! کیا یہ سنگین المیہ نہیں کہ ماضی کا وہ آج جس کا ذکر بابا جیؒ نے کیا ہمارے حال کا بھی آج ہے اور دونوں میں سرِ مُو فرق نہیں۔ تعلیم کا سلسلہ ضرور جاری ہے۔ لیکن استاد اور شاگرد کا عظیم و محترم رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ آج تعلیم کے شعبے میں جو افراتفری اور دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے اور تعلیم کو جس طرح بے شعوروں کا کھیل بنا دیا گیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بظاہر تحصیلِ علم اور تعلیم کے نام پر امتحانات میں نقلیں اور رشوتیں جس طرح چلتی ہیں اور جس غنڈہ گردی سے کام لیا جاتا ہے کیا اس سے بڑھ کر پستی کردار ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اور بھی بڑے بڑے کارنامے انجام پاتے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ تعلیم سے متعلق ایسے طرزِ عمل پر محترم بابا جیؒ کا ایک ہی فقرہ قولِ فیصل بنتا ہے۔ آپ نے لکھا۔ "نتیجہ اس کا یہ کہ طلباء کے دل میں رفتہ رفتہ یہ خیال راسخ ہوتا چلا جاتا ہے کہ کامیابی کے لئے فریب کاری یا تشدد و تخویف سے زیادہ مؤثر ذریعہ کوئی نہیں" ذرا سوچئے! کیا آج ہمارے طلباء پر یہ بات صادق نہیں آتی؟ اور یہ سب اس لئے کہ

> "جہاں تک نصابِ تعلیم کا تعلق ہے اس میں انسانی اقدار کا کوئی حصہ نہیں، اس کی ساری عمارت مغرب کے مادی نظریۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہے جس کی رُو سے زندگی کا مقصد (EAT , DRINK AND BE MERRY) ۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست ۔۔ سے زیادہ کچھ نہیں۔"

> "جو کچھ انہیں اسلامیات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے ان کے دل میں اُلٹا مذہب کے خلاف نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہوتا ہی مضحکہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ جب وہ مذہب کے اجارہ داروں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہیں تو ان کی نفرت کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔"

اب آپ ہی بتائیے کہ چوبیس سال پہلے کا لکھا ہوا بابا جیؒ کا یہ سچ آج بھی اسی طرح قائم نہیں ہے؟ اور درس گاہوں سے فارغ ہونے کے بعد ہماری طالب علم برادری کو جن ناقابلِ برداشت حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ بابا جیؒ نے اس وقت کی جو نقشہ کشی کی تھی، پون صدی گزر جانے پر بھی اس نقشہ کی لکیریں جوں کی توں اپنی جگہ پر ثبت ہیں۔ زمانہ کتنا آگے بڑھ گیا مگر ہمارا آج ہمارے کل سے بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ دیکھئے! ماضی کے آج میں بابا جیؒ نے پڑھے لکھے نوجوانوں کے معاشی مسئلہ کے بارے میں کیا لکھا تھا۔

> "بیکار اور بے روزگار نوجوانوں کے یہ غول کے غول جس معاشرہ میں پریشان حال چھوڑ دیئے جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اس میں دو ہی گروہ بستے ہیں۔ ایک وہ جو بے پناہ لوٹ میں مصروف ہے اور دوسرا وہ جو چپ چاپ نکلتا چلا جا رہا ہے۔ یہ نوجوان دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں جس

قدر کوئی شخص زیادہ فریب کار، چالباز، بددیانت افسروں کو رشوت اور قانون کو جُل دینے والا ہے اتنا ہی کامیاب ہے اور جو یہ حربے استعمال نہیں کرتا اسے اس کے ہمعصر بزدل کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ قدم قدم پر ناکام رہتا ہے۔ لوٹنے والا طبقہ جس قدر دولت سمیٹتا جا رہا ہے اسی قدر اس کی ہوس زراندوزی بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف لٹنے والا طبقہ لٹتے لٹتے اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں اب مزید پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں رہی۔"

کیا یہ ہوبہو آج کے حالات کی ترجمانی نہیں ہو رہی؟ ایسا کیوں ہوا اور ایسا کیوں ہے! باباجیؒ کی تحریر اس کا جواب دیتی ہے

"یہ ہے وہ معاشرہ جس میں ہمارے نوجوان طالب علم گروہ در گروہ دھکیلے جا رہے ہیں — افسردہ دل، مضطرب و بے چین، ناقۂ بے زمام کی طرح اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کریں اور کدھر جائیں۔ یہ ہمارے وہ نونہال ہیں جنہیں (۱) اپنے گھروں میں انسانی اقدار کی کوئی تربیت نہ مل سکی (۲) جنہیں تعلیم گاہوں میں نہ بلند کردار سیرت کے اساتذہ ملے اور نہ ہی انسانیت ساز تعلیم (۳) اور جنہیں فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہم نے اس معاشرہ میں دھکیل دیا۔ جہاں انہیں اپنے لئے کشاد کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی اور جس میں ہر طرف بے راہ روی پھیلی ہوئی ہے .... نوجوانوں کی یہی پریشان حالی اور لا دلدئی ہے جس سے ہمارے موقعہ پرست اربابِ سیاست فائدہ اٹھا کر انہیں نہایت آسانی سے EXPLIOT کر لیتے ہیں۔ اس میں ان کی کچھ کاریگری نہیں، آتش گیر مادہ پہلے سے موجود ہوتا ہے وہ اس میں صرف ایک چنگاری پھینک دیتے ہیں اور — دیوانہ را ہوئے بس است — کے مصداق ہنگامہ آرائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔"

دیکھئے تو سہی اس مردِ دانا کے اس چوبیس سال پہلے کے تجزیہ کے آئینے میں ہمیں اپنی شکل نظر نہیں آتی کیا؟؟ باباجیؒ نے تعلیم کی طرف سے ہونے والی غفلتوں کا ذکر کر کے اسے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اصولی طور پر اس کی اصلاح کا ایسا مستقل طریق کار بتایا ہے جو ماضی، حال اور مستقبل تمام زمانوں پر محیط ہے۔ ساری بات نظام کے بدلنے کی ہے جس کے لئے اکتیس سال اُدھر جناب پرویزؒ نے یہ صائب رائے دی تھی کہ "ہم اپنی تعلیم کے پورے نظام کو اس طرح بدلیں کہ بچوں کو تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، معاشیات، عمرانیات، سائنس، غرضیکہ جو کچھ بھی پڑھایا جائے، اس کی رگوں میں غیر شعوری طور پر پاکستانی آئیڈیالوجی (یعنی یہ حقیقت کہ اسلام میں دین اور دنیا میں کوئی ثنویت [illegible] نہیں، اور جب ہمارے بچے ان درسگاہوں سے واپس آئیں تو مختلف دنیاوی علوم کے علمبردار ہونے کے ساتھ وہ اس آئیڈیالوجی کو اپنی زندگی کی اصل و بنیاد سمجھیں — ہمیں اپنے ملک کا نظامِ تعلیم یکسر بدل کر قرآنی قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ نیز بچوں کی تعلیم کا مسئلہ اُن کے

کی انفرادی اور ذاتی ذمہ داری نہ سمجھا جائے بلکہ اسے مملکت کی مشترکہ ذمہ داری قرار دیا جائے اور اس میں امیر اور غریب کے بچے میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ انہی بچوں نے کل کی پاکستانی قوم بننا ہے اور قوم بنانا افراد کی ذمہ داری نہیں ہوتی، مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔"

اس باب میں باباجیؒ آخر میں یوں ہمارے دلوں پر دستک دیتے ہیں۔

"ہم اہلِ پاکستان نے تعلیم کے مسئلہ کی طرف سے جو مجرمانہ تغافل برتا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل سے اپنی جداگانہ ہستی کے جواز اور وجوب کا احساس گم ہو رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ اور اسی طرح جاری رہا تو یہاں اس آئیڈیالوجی کا تصور ہی ناپید ہو جائے گا جس پر مملکت پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے اور اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے (نتیجہ تو سامنے آچکا، یہ تھی مردِ دانا کی فہم و فراست)۔ چنانچہ یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم کو ایسے نہج پر ڈالیں جس سے وہ "دین اور دنیا" دونوں کو ایک ہی ذات میں سمو لیں اور اس کے لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ملک سے اسکولوں اور مکتبوں، کالجوں اور دارالعلوموں کا امتیاز ختم کر کے اپنی درسگاہوں میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس سے "مسٹروں" اور "مولویوں" کا جداگانہ وجود ختم ہو جائے۔"

تعلیم کے حوالے سے باباجیؒ کے پیش کردہ یہ وہ حقائق اور ہدایات ہیں جن پر غور کر کے رہنمائی حاصل کرنا اور عمل میں لانا نہ صرف ہمارا کام ہے۔ بلکہ فی الوقت یہ اوّلین فریضہ ہے۔ اسی سے باباجیؒ کی یاد کا حق ادا ہو سکتا ہے۔

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہو گی اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔ (حضرت عمرؓ)

ساجد محمود

جاگو ہوا سویرا

سلیم بھائی!

بھلا اس میں خفا ہونے والی کونسی بات تھی کہ تمہاری کشادہ پیشانی پر بل آ گئے۔ بات تو میں نے صرف اتنی ہی کی تھی کہ ادھر باباجیؒ کی آنکھیں بند ہوئیں اُدھر تم نے بھی آنکھیں بدل لیں، کیا میں نے غلط کہا تھا؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ کہاں گئے تمہارے وہ دعوے کہ یہ فکر ہی تمہارے لئے حاصلِ زیست ہے اور تم اس فکر کی اشاعت اور توسیع کے لئے خونِ جگر کے چراغ جلاؤ گے، اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤ گے۔

میں نے کب انکار کیا ہے کہ تم باباجیؒ کی کتابیں نہیں پڑھتے، طلوعِ اسلام کا شمارہ نہیں پڑھتے یا درسِ قرآن نہیں سنتے۔ مگر سوچو تو سہی کیا تمہاری اتنی ہی ذمہ داری ہے کہ ہفتہ وار درسِ قرآن سُن لیا، طلوعِ اسلام کا شمارہ پڑھ لیا یا کبھی کبھار کتابوں والی الماری کھول کر گرد صاف کرتے ہوئے ایک دو صفحے کسی کتاب کے پڑھ لئے تاکہ محلے کے مولوی پر اپنی "علمیت" کا رعب جما سکو۔ چلو اس ماہ کو چھوڑو، پچھلے ماہ، اس سے پچھلے ماہ، بلکہ اس سے بھی پچھلے ماہ کتنے آدمیوں تک تم نے طلوعِ اسلام کا شمارہ پہنچایا، کتنے آدمیوں تک قرآنی فکر سے مزین کتابیں پہنچائیں، کتنے آدمیوں کو درسِ قرآن سننے کی دعوت دی۔ اپنے ضمیر کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر بتاؤ کہ تم نے قرآنی فکر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کیا، کیا ہے؟

تمہارا یہ کہنا کہ لوگ تمہاری باتوں پر دھیان نہیں دیتے تو اس ضمن میں میری یہ بات یاد رکھو کہ اس راہ میں جلد بازی سے کام نہیں چلے گا۔ اس میدان میں تمہاری روش معالج اور مریض کی طرح ہونی چاہیئے جس میں مرض سے عداوت اور مریض سے محبت کی جاتی ہے۔ تمہیں علم ہونا چاہیئے کہ جراح جب عملِ جراحی انجام دیتا ہے تو مریض بڑبڑاتا ہی نہیں بلکہ چیختا چلاتا اور بعض اوقات جراح کو بُرا بھلا بھی کہہ دیتا ہے۔ اس دوران جراح کی محبت اور شفقت کا تقاضا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ مریض کے ان منفی، عارضی اور ہنگامی جذبات سے اپنے آپ کو بلند رکھے اور صبر، تحمل اور رواداری کے ساتھ عملِ جراحی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لے۔

سلیم بھائی! پھر وہی رونا، پھر وہی بہانہ سازی، مانا کہ تمہارے پاس اتنی زیادہ رقم نہیں ہوتی کہ قرآنی لٹریچر کو خرید کر وسیع پیمانے پر پھیلا سکو۔ لیکن اتنی کم بھی نہیں ہوتی کہ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے شرم محسوس کرو اور کسی کو "اسبابِ زوالِ امت" جیسی سستی سی کتاب بھی تحفتاً نہ دے سکو۔ ذرا سوچو یہ جو تم روزانہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک کر اپنے آپ کو جلاتے ہو، تمہاری جیب میں "کچھ نہ کچھ" ہونے کا ثبوت ضرور ہے۔ ابھی پچھلے ہی ماہ تم نے کپڑوں کا نیا جوڑا سلوایا تھا، جوتے بھی حال ہی میں خریدے تھے لیکن پھر بھی عید پر نئے کپڑے بھی بنیں گے اور جوتا بھی نیا آئے گا۔ کیا یہ بلاضرورت نہیں۔ تم خود ہی اپنا "محاسبہ" کرو اور دیکھو کہ ایسی بہت سی چیزوں پر تم رقم خرچ کرتے ہو جن کی ضرورت تو ہوتی ہے مگر گذارہ اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہی رقم قرآنِ کریم کی نشر و اشاعت کے کام آسکتی ہے۔

سلیم بھائی! باباجیؒ نے تمہیں اپنے خونِ جگر سے خطوط لکھے تھے، کتنا فخر تھا انہیں تم پر، کتنی راتیں جاگ جاگ کر انہوں نے تمہارے ذہن میں کلبلانے والے سوالات کے جوابات قرآنِ کریم کی روشنی میں دیئے تھے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ تم جیسا قلبِ سلیم رکھنے والا نوجوان اپنے سوالات کے جوابات پانے کے بعد "ظلمت" سے "نور" کی طرف ارتقائی سفر شروع کر دے گا اور گلی گلی، کوچہ کوچہ تن من دھن سے یہ خطوط دوسرے نوجوانوں تک پہنچائے گا۔ تمہاری امانت میں یہ خطوط اس وقت تک ہیں جب تک ان کو خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھاؤ گے کیونکہ ان خطوط کے ذریعے باباجیؒ تمام ایسے نوجوانوں سے مخاطب ہیں جو قلبِ سلیم رکھتے ہیں۔ اگر نہ خود سمجھ کر اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرو گے اور نہ دوسروں کو "ظلمت" سے "نور" تک کا سفر طے کرنے میں مدد دو گے تو امانت میں خیانت کے مرتکب ہو گے۔

تمہاری ذرا سی غفلت، لاپرواہی اور غیر ضروری کاموں میں مصروفیات کی وجہ سے نہ جانے کتنے "قلبِ سلیم" جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں سہارے کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے۔ پہلے تو کوئی سہارا ان کے ہاتھ آئے گا ہی نہیں، اگر بالفرض انہوں نے کسی خوش فہمی اور غلط فہمی کی وجہ سے کسی کو سہارا سمجھ بھی لیا تو چند قدم چلنے کے بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ گہری کھائی میں ہوں گے۔ کیونکہ یہاں تو حالت یہ ہے کہ جہالت ہی کو تھوڑی سی تراش خراش کے بعد علم بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے اور پھر اس زور شور سے اس کے علم ہونے کا یقین دلایا جاتا ہے کہ بالآخر طالبِ علم کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ جہالت کو علم تسلیم کرے۔ یہاں تو تاریکی اور روشنی میں خطِ امتیاز کو ختم کر دیا گیا ہے اور جب کوئی بصارت رکھنے والا کہتا ہے کہ یہ تو تاریکی ہے، روشنی ایسی تو نہیں ہوتی، تو یہ "روشنیوں کے تاجر" لال پیلے ہو کر کہتے ہیں تم خود اندھے ہو بھلا تمہیں روشنی خاک نظر آئے گی۔ پھر تاریکی کی شان میں وہ قصیدے پڑھے جاتے ہیں کہ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ بصارت رکھنے والا بھی اپنی بات پر قائم رہا ہو۔ یہاں تو قدم قدم پر شکاری گھات لگائے بیٹھا ہے۔ تم خود دیکھ سکتے ہو ان "روشنیوں کے تاجروں" میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بھلا کیوں نہ

ہو جب کہ وہ "روشنیوں" کی جگہ تاریکیاں ہیروں کے مول بیچ رہے ہیں۔

سلیم بھائی! ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو اس وقت تمہارے جیسے نوجوانوں کا "حرکت" میں آجانا کتنا ضروری ہے جب تم جیسے نوجوان حرکت میں آجائیں گے تو اس ملک کے کتنے بے بس، مظلوم اور غریب لوگوں کے خوابوں کی تکمیل کا سفر شروع ہو جائے گا۔ تمہارا جوان خون، تمہاری بلند نگہی اور عملِ پیہم صدیوں کی مسافت کو سالوں میں تبدیل کر دے گا۔ میرے عزیز بھائی، تم تنہا نہیں ہو گے، تمہارے ساتھ ایک ایک، دو دو کر کے قلبِ سلیم رکھنے والے نوجوان ملتے جائیں گے۔ پھر نیرِ اعظم کی کرنیں ایک صبح قلبِ سلیم رکھنے والے نوجوانوں کا قافلہ دیکھیں گی جو تاریکیوں اور روشنیوں میں خطِ امتیاز کھینچ رہا ہو گا، جس کا ہر قدم جہالت اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو روندتا ہوا روشنیوں کی طرف اٹھ رہا ہو گا جو انسان پر سے انسان کی حکمرانی کو ختم کرے گا، غربت اور امارت کے امتیاز کو مٹا دے گا، بندے اور خدا کے درمیان مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خلیج کو پاٹ دے گا، پھر وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا کا منظر ہو گا۔

سلیم بھائی! سلیم بھائی! یہ تیرا خواب ہے نہ میرا خواب ہے یہ باباجیؒ کا خواب تھا۔ یہ تو ہر مسلمان کا خواب ہے، نہیں، نہیں یہ خواب تو نہ تھا، بھلا خواب اپنے بس میں کب ہوتے ہیں، وہ تو بہم ہوتے ہیں، ہم نے تو گہرے غور و فکر کے بعد اس "قرآنی سفر" کو شروع کیا تھا، ہم پر تو ہر بات پہلے ہی دن سے واضح تھی، ہم تو اپنے زادِ سفر سے بھی آگاہ تھے اور ان خار دار جھاڑیوں سے بھی جو اس راستے میں آنی تھیں، ہمیں تو ان کانٹوں کا بھی علم تھا جنہوں نے ہمارے پاؤں چھلنی کرنے تھے اور اُن آبلوں سے بھی لاعلم نہیں تھے جن کی وجہ سے ہمارے پاؤں سُوج سوج کر دوگنے کے ہو جانے تھے اور ہمارا چلنا دوبھر ہو جانا تھا، ہمیں تو اس پیاس کی شدت کا بھی اندازہ تھا جس کو ہم نے پیتے ہوئے صحرا سے گزرتے ہوئے برداشت کرنا تھا، ہم تو اپنی صلیبیں دائیں ہاتھ میں اور کفن بائیں ہاتھ میں لے کر چلے تھے، پھر تم قدم دو قدم چل کر رُک کیوں جاتے ہو، تمہاری آنکھیں سایوں کی تلاش میں کیوں بھٹک جاتی ہیں، چند میل کی مسافت کے بعد ہی گھنے سایہ دار درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر سانس بحال کرنے میں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو جب کہ تمہیں بھی علم ہے یہ سایہ لمحہ، دو لمحہ کے لئے ہے، پھر وہی جلتی ہوئی دھوپ اور تپتی ہوئی ریت ہو گی، آؤ پہلے منزل پر تو پہنچ لیں، ٹھنڈے پانی کے چشمے ہمارے منتظر ہوں گے، سایوں سے بُنا سائبان ہو گا۔

میرے بھائی، میرے عزیز بھائی ہر قدم پہلے قدم پر نہیں پڑنا چاہیئے بلکہ اس سے آگے پڑنا چاہیئے۔ تاکہ تمہارے پیچھے آنے والوں کو منزل پر پہنچنے کے لئے راستے کے انتخاب میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے اور ان کو خود اعتمادی بھی حاصل ہو کہ ان راستوں پر چلنے والے وہ پہلے نہیں بلکہ پہلے بھی کوئی چلا تھا۔ پھر ہم ان خار دار جھاڑیوں کو بھی کاٹتے جائیں گے تاکہ وہ زیادہ مصائب کا سامنا نہ کریں۔

سلیم بھائی! اب یہ جمائیاں لینا چھوڑو، چلو شاباش صبح ہوگئی ہے اپنے سفر پر نکلیں، پہلے طاہرہ بہن کے گھر چلتے ہیں، کچھ دیر اس سے باتیں کریں گے اور اُس کے کان بھی کھینچیں گے، باباجیؒ کے خطوط شاید وہ بھی بھولتی جارہی ہے، جلدی سے اٹھ بیٹھو، میں طاہرہ بہن کو اپنی آمد کی اطلاع کردوں۔

حُسنِ اثر

زمانے میں صلاحیت کی ارزانی نہیں ہوتی
جوانی عام ہو جاتی ہے لاثانی نہیں ہوتی

زمانہ بندۂ مزدور کے زخمِ جگر سارے
دکھاتا ہے! رفوئے چاک دامانی نہیں ہوتی

سیاست، کھیل، ہر جوشِ جنوں ملتا ہے کالج میں
گِلہ کر دوں! صنعتِ روحِ انسانی نہیں ہوتی

مسخر ہو گئے ارض و سماء افکارِ انساں سے
فقط کردار سے افشائے ایمانی نہیں ہوتی

ہزاروں حکمراں آتے ہیں میدانِ سیاست میں
مگر اُن کی دلوں پر کوئی سُلطانی نہیں ہوتی

فسوں کاری سے وہ آئین باقی نہیں رہ سکتا
ربُوبیت کی جس میں شانِ قُرآنی نہیں ہوتی

ثناخوانِ محمدؐ چھا رہے ہیں اُفقِ[1] عالم پر
مؤدب کی ادا بے سوزِ وجدانی نہیں ہوتی

ملک حنیف وجدانی

[1] روس کی آزاد مسلم ریاستوں کی انگڑائی

حقائق و عبر

مسلمان مرد معقول جواز کے بغیر طلاق نہیں دے سکتا۔ بھارتی عدالت کا فیصلہ۔

"نئی دہلی (نمائندہ جنگ) بھارت میں گوہاٹی ہائیکورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ مسلمان مرد کسی معقول جواز کے بغیر اور مصالحت کے لئے کسی اجلاس کے انعقاد کے بغیر اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ انڈین ایکسپریس کے مطابق عدالت نے کہا کہ قرآن نے طلاق کی حوصلہ شکنی کی ہے اور طلاق کی اجازت انتہائی ناگزیر حالات میں مصالحت کی کوشش کے بعد ہی دی گئی ہے۔ یہ فیصلہ ایک مسلمان خاتون کی درخواست پر دیا گیا ہے۔" (جنگ کراچی ۵/۹۳)

طلوعِ اسلام

عدالت کے فیصلے کی نقل ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ تاہم سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۹ سے اس طرف ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ طلاق کی صورت میں خاوند نے بیوی کو جو کچھ دیا ہو وہ اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا، بجز اس کے کہ دونوں (خاوند۔ بیوی) کو یہ خوف لاحق ہو کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ ازدواجی حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ (اس "بجز" نے یہاں یہ گنجائش پیدا کر دی کہ علیحدگی کی ذمہ داری اگر دونوں پر عائد ہوتی ہو، تو وہ باہمی رضامندی سے حقوق و واجبات کی فہرست میں حسبِ حال ردّ و بدل کر لیں اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو قوم (معاشرہ) اس کا فیصلہ کر دے۔ یہاں تک کہ ازدواجی قوانین کی پاسداری اگر بیوی کے بس کی بات نہ ہو تو تلافی وہ کرے۔ ہر چند کہ یہ قوانین طلاق کے بعد حقوق و واجبات کی ادائیگی سے متعلق ہیں لیکن ان سے ایک بات بہرحال عیاں ہے کہ عقد نام ہے ازدواجی حدود کی پاسداری کا اور طلاق ردّ عمل ہے ان حدود کی پامالی کا۔ چاہے وہ خاوند کی طرف سے ہو چاہے بیوی کی طرف سے۔ قرآن نے طلاق پر براہِ راست تو کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ تاہم اصلاحِ احوال کے لئے ایک طرف ثالثی کونسل (۴/۳۵)

کی گنجائش رکھ دی ہے تو دوسری طرف اس کے لئے تلافیِ مافات کا قانون بنا دیا ہے جس کے تحت خاوند طلاق دے تو سے اس مال سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں جو وہ بیوی کو دے چکا ہو اور اگر بیوی ایسا کرنا چاہے تو اسے زرِ خلع ادا کرنا ہوگا۔ قرآن کریم کے ان قوانین پر دیانتداری سے عمل کیا جائے تو جذباتی طلاقوں کی روش پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

اہل فکر و نظر اس موضوع پر قرآن کی روشنی میں لکھنا چاہیں تو طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر ہیں۔

۲۔ ماموں کانجن کے درجنوں دیہاتیوں کو اپنی بیویوں سے دوبارہ نکاح پڑھوانے پڑ گئے

"ماموں کانجن (نامہ نگار) ماموں کانجن کے نواحی گاؤں دربار پیر صلاح الدین کے درجنوں افراد کو اپنی بیویوں سے دوبارہ نکاح کرنے پڑے ہیں کیونکہ انہوں نے قربانی کا گوشت کھانے سے پہلے چاولوں کی نیاز دے دی تھی۔ عید سے ایک روز قبل موضع دربار پیر صلاح الدین موضع حکم کے کاٹھیہ، عالم شاہ تاجا اور دیگر چکوک میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ پیر شیخوپورہ شریف والوں کو بشارت ہوئی ہے کہ عید قربان پر قربانی کا گوشت کھانے سے پہلے جو شخص سوا دو کلو چاولوں کی نیاز نہیں دے گا وہ گوشت کھانے سے باؤلا ہو جائے گا۔ یہ سُنکر سادہ لوح دیہاتیوں نے قربانی کا گوشت کھانے سے پہلے نیازیں بانٹنی شروع کر دیں۔ جس پر موضع دربار پیر صلاح الدین کے امام مسجد خطیب مفتی محمد یوسف نے یہ فتوے دے دیا کہ نیازیں دینے والوں کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں۔ لہٰذا وہ دوبارہ نکاح پڑھوائیں اس پر درجنوں افراد نے مفتی محمد یوسف سے دوبارہ نکاح پڑھوائے۔

(روزنامہ جنگ ۸ جون ۹۳ء)

طلوعِ اسلام

فیس نکاح کا علم نہیں ہو سکا۔

۳۔ ایک خط ایک حقیقت

ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے وقت عمر کے بارے میں جس نشریہ کا حوالہ دیا ہے وہ کسی سوال کے جواب میں نہیں بلکہ پروگرام روشنی میں شاہ بلیغ الدین صاحب کی تقریر میں یہ تحقیق پیش کی گئی جو مستند تاریخی شواہد پر مبنی تھی۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک مستند روایت ہے کہ عائشہؓ مجھ سے دس

برس چھوٹی تھی۔ ۷۳ھ ہجری میں جب حضرت اسماءؓ کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ کو بیت اللہ شریف میں شہید کیا گیا اور اس کے چند یوم بعد حضرت اسماءؓ کی وفات ہوئی اُس وقت اُن کی عمر ایک سو برس اور تین ماہ تھی۔ (بخاری۔ اسد الغابہ)۔ اس طرح ہجرت کے وقت حضرت اسماءؓ کی عمر ۱۰۰ - ۷۳ = ۲۷ سال ہوئی۔ یعنی حضرت عائشہؓ کی عمر اس وقت ۲۷ - ۱۰ = ۱۷ سال ہوئی۔ ہجرت سے ایک سال پہلے نکاح ہوا، تو عمر ۱۶ برس ہوگی اور ۲ ہجری میں جب رخصتی ہوئی تو عمر بلاشبہ ۱۹ برس ہونا چاہیئے۔ بخاری شریف کی پریس میں اشاعت تو دو سو سال سے کم کی بات ہے، اس سے پہلے تو کاتب قلم سے اس کی نقول تیار کرتے تھے، کون جانے کب کس کاتب سے ۹ کے ہندسہ کے ساتھ ایک کا ہندسہ لکھنا رہ گیا اور یہ عمر اُنیس سے ۹ برس بن گئی اور پھر اس پر شعبہ اور مستشرقین نے سیدہ ام المومنینؓ اور سید المرسلینؐ پر اپنی دریدہ دہنی کے لئے جواز ڈھونڈ لیا۔ شاہ صاحب نے جن حوالوں سے استدلال کیا ہے ہم نے ان کی تصدیق کر لی ہے وہ بالکل درست ہیں اس لئے اُن کے استدلال کو نشر کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ تاریخ میں یہودی منافقین سیرت نگاروں نے تو حضورؐ کے بچپن کے بارے میں بھی بے شمار غلط اور خود ساختہ روایات شامل کر دی ہیں، اصل حقائق کچھ اور ہیں جن کا ثبوت قرآن اور حدیث شریف کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ فی امان اللہ۔

آپ کا مخلص
عبدالحی قریشی
ڈپٹی کنٹرولر (شعبہ ڈیٹی)
پی ایل سی صدر دفتر اسلام آباد۔

طلوعِ اسلام

یہی بات پرویزؒ نے کہی تو کافر کہلایا۔

طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ سنّتِ رسولؐ اللہ کو نہ مانو اور سب حدیثوں کو دریا بُرد کر دو۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ حدیثوں کی کتابوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ جو حدیث قرآنِ کریم کے مطابق ہے وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف جاتی ہے وہ غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی غلط حدیثوں کو چھوڑ دو اور صرف صحیح حدیثوں کو مانو۔

طلوعِ اسلام یہ بھی نہیں کہتا کہ اسلاف کی کوئی بات نہ مانو۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ اسلاف کی کتابوں میں بھی جو کچھ ہے اسے قرآنِ کریم کی کسوٹی پر پرکھ لو۔ جو بات اس کے مطابق ہو، اسے صحیح مانو، جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دو۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ ہمارے بزرگوں نے قرآن کو نہیں سمجھا تھا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ قرآن شریف ہر ایک کو حکم دیتا ہے کہ وہ اسے غور و فکر سے سوچ سمجھ کر پڑھے۔ اس لئے ہمیں قرآن شریف پر غور کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

طلوعِ اسلام کوئی نیا فرقہ نہیں بنانا چاہتا۔ فرقہ بنانا قرآنِ کریم کی رو سے شرک ہے۔

طلوعِ اسلام کوئی نیا مذہب ایجاد کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد، مکمل اور آخری ضابطۂ حیات ہے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں اور اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے۔

طلوعِ اسلام چاہتا یہ ہے کہ

جس طرح کی حکومت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے قائم کی تھی، اسی قسم کی حکومت پاکستان میں قائم کی جائے۔ تاکہ ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی باطمینان پوری ہوتی رہیں اور کوئی بھوکا ننگا نہ رہے۔ ہر شخص سے عدل و انصاف ہو اور قرآنِ کریم کے خلاف جس قدر قانون ہیں سب منسوخ ہو جائیں اور قانون صرف خدا کا چلے۔ یہ بات ان لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے جو خالص خدا کا قانون نہیں چاہتے کیونکہ اس سے ان کی ذاتی اغراض پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے وہ طلوعِ اسلام کی مخالفت کرتے ہیں۔

سید حیات النبی رضوی

نظامِ ربوبیّت عامہ
اور
اصطلاحات

طلوع اسلام کے اپریل ۹۳ء کے شمارے میں محترم اسلم رانا صاحب کا ایک مضمون "نظامِ ربوبیت عامہ" کے
عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں فاضل مضمون نگار نے بڑی تفصیل سے قرآن کریم کی روشنی میں نظامِ خداوندی یا نظام
ربوبیت کا جائزہ لیا ہے اور اسلام کے دورِ اوّل میں اس کے ثمرات اور بعد میں اس نظام کی روگردانی سے مرتب ہونے
والے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے بعد اس مضمون کا زیادہ تعلق اقتصادیات سے ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ مضمون نگار کی نظر میں "نظامِ ربوبیت" سے مراد نظامِ اقتصاد ہی ہے۔ چنانچہ پورے مضمون میں "نظامِ ربوبیت" کی
اصطلاح کو انہی معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے۔ درآں حالیکہ مصنف انسانی ذات کی نشوونما کو پوری پوری اہمیت دیتا ہے
اور قرآنِ کریم کے حوالہ جات بھی نقل کرتا ہے۔ اسی "نظامِ ربوبیت" کے ضمن میں ڈنمارک اور انگلستان کے نظامِ اقتصاد
کا حوالہ دے کر ڈنمارک کے "البرٹ سلنڈ بلدیہ" کے نظامِ کار کا مطالعہ و مشاہدہ تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔
ڈنمارک کی بلدیہ البرٹ سلنڈ کا یہ مطالعہ و مشاہدہ بڑا معلوماتی ہے اور یقیناً مصنف کے الفاظ میں "ہمارے سفارتکاروں
کا یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ جہاں انسان کی منفعت کے اصول یا انداز عملی صورت میں دیکھیں ان کا خاکہ ملک کو روانہ کریں"
—— اسلم رانا صاحب ایک پاکستانی کی حیثیت سے ایک پاکستانی سفیر ہی کی طرح تھے۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ
دیکھا اور جو کچھ ان کے تجربے میں آیا وہ انہوں پاکستانی قوم کے سامنے پیش کر دیا جو محوّلہ بالا طلوع اسلام کے صفحہ ۲۸ سے
صفحہ ۴۲ تک پھیلا ہوا ہے —— مگر راقم الحروف کا مقصد زیرِ نظر تحریر میں اس مضمون کا تعارف کرانا نہیں
ہے بلکہ اس مضمون میں جمہوریت، نظامِ ربوبیت، خلافت، سلطنت اور ملوکیت کی اصطلاحات جس انداز سے استعمال
کی گئی ہیں اس کو قارئین کے سامنے لانا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ان اصطلاحات کو محولہ بالا
مضمون کے مخصوص سیاق و سباق میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہر اصطلاح کا ایک خاص مفہوم ہوتا

...ر اس کے غیر متعلق سیاق وسباق قاری کے ذہن میں ابہام پیدا کر سکتے ہیں!

صفحہ ۲۹ کے تیسرے پیراگراف کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ" حضور پُرنور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ...رآن کے ان گوہر پاروں پر مبنی ایک ایسا عدیم النظیر "جمہوری نظام" دنیا کے سامنے پیش کیا جس میں نہ تو کوئی حکمرانوں ...بقہ تھا اور نہ ہی اس کا دستور عوام کی رائے سے مرتب کردہ تھا بلکہ اس نظام کا دستور از روئے وحی اللہ تعالیٰ کا ...کردہ تھا جس میں ہر طرح کی آزادئ ضمیر تھی" ——— جمہوری نظام یا جمہوریت ایک معروف اصطلاح ہے ...دینِ اسلام" کا نعم البدل نہیں ہو سکتی خواہ آپ اسے" عدیم النظیر" ہی کیوں نہ کہہ دیں. اگر اس میں حکمرانوں کا کوئی ...نہیں تھا، تو وہ جمہوریت کیسے ہو سکتی ہے اور اگر وہ جمہوریت تھی تو اس کا دستور عوام کی رائے سے مرتب کیوں نہ ...تھا کیونکہ ؎

"جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
افراد کو گنتے تو ہیں، تولا نہیں کرتے"

...ری نظام ایک پورا پس منظر ہے اور یہ اصطلاح ایک خاص نظام کے لئے وضع ہوئی تھی جس میں عوام یا افرادِ قوم ...ر دیا انسانوں کی ہی حکومت، انسانی ذہن کے ساختہ و پرداختہ قوانین کے ذریعے کی جاتی ہے۔ جمہوریت کے ساتھ ...نظام کا دستور از روئے وحی اللہ تعالیٰ کا تلقین کردہ" نہیں ہو سکتا۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹ میں واضح طور پر بتا دیا ...کہ " دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"۔ اور سورۂ حج کی آیت ۷۸ میں کہہ دیا گیا کہ" ہم نے تمہارا نام پہلے بھی ...رکھا تھا اور اب بھی یہی ہے" ——— ان واضح ہدایات کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ...ہے کہ وہ اپنے نظام کے لئے " دینِ اسلام " کی اصطلاح ہی استعمال کریں۔ اسلامی جمہوریت، اسلامی سوشلزم، ...ی اشتراکیت اور اسلامی بینکاری وغیرہ اصطلاحات حد درجہ گمراہ کن ہیں اور ابہام زدہ ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ ہماری ...ب یہ ہو چکی ہے کہ اپنی پارلیمنٹ کو مجلسِ شوریٰ اور سود کو مارک اپ یا منافع کہہ دینے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں ...سلامی نظام نافذ کر دیا۔ راقم کے نزدیک تو اسلامی تاریخ، اسلامی فنِ تعمیر، اسلامی طرزِ آرائش اور بلاطِ اسلامی ...ک ٹائیلز جو اسپین وغیرہ میں بنائے جاتے ہیں) کی اصطلاحات بھی بذاتِ خود غلط ہیں۔ درحقیقت ان علوم کا مقصد یہ ...رنا ہوتا ہے کہ متعلقہ معاملات میں مسلمانوں کا رویہ کیا تھا، اگر مسلم تاریخ، مسلم فنِ تعمیر، مسلم طرزِ آرائش اور مسلمانوں کے ...کے الفاظ استعمال کئے جاتے تو زیادہ قرینِ قیاس تھے۔

صفحہ ۳۳ پر آخری پیراگراف ملاحظہ فرمائیں، ——— " نظامِ ربوبیت کے یہ خاص ادارے یوں تو مغرب ...د اقوام نے قائم کر رکھے ہیں۔ تاہم میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ صرف دو سلطنتوں تک ہی محدود ہے۔ ویسے مطالعہ ...سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سلطنتوں میں نظامِ ربوبیت فعال اور مؤثر ہے۔ ڈنمارک میں نظامِ ربوبیت کے

یہ خاص ادارے دوسری جنگِ عظیم کے دوران متعارف ہوئے تھے اور انگلستان میں ۱۹۴۵ء میں متعارف ہوئے۔"

درج بالا اقتباس مضمون کے اُس حصے میں ہے جہاں نظام اقتصاد، روٹی کا مسئلہ اور انسانی ذات کی نشو و نما پر زور دیا گیا ہے اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، سعدی شیرازی اور قرآنی حوالوں سے قرآنی نظامِ ربوبیت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، علامہ اقبال کے مصرعے مستزاد ہیں۔

راقم الحروف نے بھی انگلستان اور یورپ کی کئی دیگر مملکتوں کا مشاہدہ کیا ہے اور وہ صاحبِ مضمون سے اس بات میں بالکل متفق ہے کہ "قوی اور توانا انا (انسانی ذات) کے لئے صحت مند توانا جسم اور آزاد شعور کا ہونا اشد ضروری ہے، یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی نہایت احسن انداز میں میسر آتی رہیں، جہاں نہ کوئی دینے والا ہاتھ ہو اور نہ ہی کوئی لینے والا ہاتھ۔" (صفحہ ۳۳) ______ مگر راقم اس بات کو بہ اصرار کہنے پر مجبور ہے کہ یورپ کی ان سماجی، فلاحی مملکتوں کے لئے "نظامِ ربوبیت" کی اصطلاح استعمال کرنا ضرورت سے زیادہ کریڈٹ دینے کے مترادف ہے اور قرآنِ کریم کی میزان میں اسی بات کو ظلم کہا جاتا ہے ______ نظامِ ربوبیت کا لفظ اپنے اندر جہانِ معنی رکھتا ہے جس میں انسانی ذات کی نشو و نما اولین و آخرین مطمعِ نظر ہے جبکہ ان مملکتوں میں رائج اقتصادی نظام اس تصور سے مکمل طور پر عاری ہے۔ مادّی تصورِ حیات نے حیات بعد الممات اور انسانی ذات کو بالکل دیس نکالا دے دیا ہے اور مملکتوں کا ان معاملات سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ایسی صورت حال میں وہاں کے فلاحی یا رفاہی نظام کو کس طرح "نظامِ ربوبیت" کہا جا سکتا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے خود اپنے مضمون کے شروع حصے میں قرآنِ کریم کے حوالوں سے بہت خوب تشریح کر دی ہے کہ نظامِ ربوبیت کے مبادیات و ثمرات کیا کیا ہیں اور ان کا حصول کس طرح ممکن ہے۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشریحات کے فوراً بعد صفحہ ۲۹ کے آخر میں درج ہے کہ "لیکن افسوس کہ افراد کی اقتدار پسندی نے اس نصب العینی نظام کو زیادہ دن قائم نہ رہنے دیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے تھوڑا عرصہ بعد امیر معاویہ (نام پر رضؓ نہیں بنایا گیا) نے خلافت کو سلطنت میں بدل دیا ______ خلافت کے سلطنت میں تبدیل ہو جانے کے ساتھ ہی ملوکیت کے انداز شروع ہو گئے جس سے سیاسی اور اجتماعی زندگی میں اسلام کا لائحہ عمل رفتہ رفتہ گل دستۂ طاقِ نسیاں بن گیا۔"

آپ نے غور فرمایا کہ مضمون نگار کی نظر میں "حضرت عمرؓ کی شہادت کے کچھ عرصہ بعد اور حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھوں خلافت سلطنت میں بدل گئی اور ملوکیت کے انداز شروع ہو گئے" ______ حضرت عمرؓ کے بعد خلافت حضرت عثمانؓ کو ملی تھی جنہوں نے ۲۴ محرم الحرام ۲۴ھ سے ذوالحجہ ۳۵ھ تک تقریباً بارہ برس خلافت فرمائی۔ اس بارہ برس کے طویل عرصہ کو "کچھ عرصہ" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ گویا "سلطنت" اور "ملوکیت" کی اصطلاحات حضرات

خلفائے راشدین حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں استعمال کی گئی ہیں جن کا شمار اجل صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ راقم الحروف مضمون کے اس موڑ پر آپ کی گہری توجہ چاہتا ہے کیونکہ ہم تاریخ کے اس حصہ پر بحث کر رہے ہیں جو حضور اکرمؐ کے ان ساتھیوں سے متعلق ہے جن کو صحابہ کرام کہا جاتا ہے اور جن کے بارے میں قرآنِ کریم نے سورۂ فتح کی انتیسویں (۲۹) آیت میں اپنا فیصلہ دیا ہے کہ:-

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ..... (۴۸/۲۹)۔

یعنی محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں مگر آپس میں رحمدل۔

اب اس قرآنی فیصلے کے بعد سلطنت اور ملوکیت کی اصطلاحات ان حضرات کرام سے منسوب کی جائیں تو ؎

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے

حضرت عثمانؓ وہ صحابیٔ رسول ہیں جو ذوالنورین کہلاتے ہیں، حضور اکرمؐ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت اُمِّ کلثومؓ آپ کے نکاح میں آئیں، آپ کی مدت خلافت لگ بھگ بارہ سال ہے اور یہ عرصہ اسلامی فتوحات کا عظیم الشان عہد کہلاتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی، اس زمانہ میں اسلامی جغرافیائی حدود میں بہت وسعت ہوئی، اس کی حدود سندھ سے اندلس تک جا پہنچیں، بحری قوت اسی عہد میں منظم ہوئی اور قبرص اور روڈس کے جزائر فتح ہوئے اسی دور میں حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھوں انطاکیہ و طرطوس کے قلعے فتح ہوئے، ۲۵ھ میں لیبیا، ۲۶، ۲۷ھ میں تیونس و الجزائر اور مراکش فتح ہوتے اور اندلس کی طرف پیش قدمی ہوئی اور شمال میں بحیرۂ اسود تک جا پہنچے۔ ۳۰ھ میں خراسان طبرستان، جرجان، سوات، کابل، سجستان اور نیشاپور اسلامی مملکت میں داخل ہوئے جس کی حدود گجرات کے ساحلی علاقوں کو چھو رہی تھیں، اس دور میں تقریباً پچاس بحری لڑائیاں لڑی گئیں اور ایک عظیم بحری بیڑہ تیار کیا گیا۔

حضرت علیؓ کا دور داخلی پریشانیوں اور شورشوں کا دور کہلاتا ہے، جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگ نہروان اس دور کی خاص یادگاریں تاریخ نے ریکارڈ کی ہیں جو بالترتیب ۳۵ھ، ۳۷ھ اور ۳۸ھ میں وقوع پذیر ہوئیں۔ پہلی جنگ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے ساتھیوں کے درمیان، دوسری جنگ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھیوں کے درمیان اور تیسری جنگ حضرت علیؓ اور خوارج کے درمیان لڑی گئی ——— بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے خلاف سُتی ہوئی ہیں مگر اس موقع پر یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی تاریخ ان واقعات کے سینکڑوں سال بعد مرتب ہوئی ہے اور عباسی دورِ حکومت میں ایک خاص نقطۂ نظر کے ساتھ رقم کی گئی ہے لہٰذا تاریخ کی ان روایتوں

پر آمنا و صدقنا کا حکم نہیں لگایا جاسکتا' اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ تاریخ کا یہ حصہ ان صحابہ کرام سے متعلق ہے جن کو قرآن کریم رحماء بینھم کی صفات سے مزین کر رہا ہے۔ اس دور کی تمام روایات کی تحقیق عمیق اشد ضروری ہے۔ مسلمانوں کی پہلی مدون تاریخ امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی "تاریخ الرسل والملوک" ہے۔ امام طبری ۲۲۴ یا ۲۲۵ ہجری یعنی تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو تاریخی واقعات کے تسلسل میں بیان نہیں کیا بلکہ ہر واقعہ سے متعلق جو بیان بھی میسر آگیا اسے نقل کر دیا خواہ یہ بیانات متضاد ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ ان واقعات کی صحت کی ذمہ داری لینے سے وہ منکر ہیں جو انہوں نے جمع کئے۔ مگر افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعد میں آنے والے مؤرخین نے بیشتر مواقع پر اسے اپنا ماخذ بنا لیا اور اس طرح تمام رطب و یابس مسلم تاریخ کا حصہ بنتا چلا گیا۔ مثلاً ان روایات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانے کے یہ دل خراش واقعات یا تو اس انداز میں وقوع پذیر نہیں ہوئے جس انداز میں تاریخ نے انہیں نقل کیا ہے اور یا پھر بہت سے واقعات آپس کی غلط فہمیوں اور سبائی گروپ کی سازشوں کا نتیجہ تھے۔ یہ بات ظنی و قیاسی بنیاد پر نہیں کہی جارہی بلکہ تاریخ کی بعض داخلی شہادتیں بھی اس کی غمازی کرتی ہیں۔ مثلاً جنگِ جمل کے بارے میں تاریخی شواہد موجود ہیں کہ حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت محمد بن مسلمہؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے اس جنگ کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ اس میں کوئی حصہ ہی نہیں لیا ——— یہ روایات بھی موجود ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا کوئی ارادہ بصرہ جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ مدینہ واپسی کے قصد سے مکہ سے نکلی تھیں' راستے میں ہزاروں افراد ان کے ساتھ ہو گئے، حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں کچھ سبائی فتنہ گر موجود تھے اور مالک الاشتر کا گروپ خاصی سیاسی طاقت بن چکا تھا' ان لوگوں کی شہ انگیزی نے منظم سازشی غلط فہمیاں پیدا کیں اور اس طرح تلوار چل پڑی، بعد میں جب غلط فہمیاں دور ہوئیں تو حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ میں کوئی رنجش نہ تھی بلکہ انہوں نے خود حضرت عائشہؓ کو مدینہ رخصت کیا اور حضرات حسنینؓ کو ساتھ بھیجا ——— جنگِ صفین کے بارے میں بھی اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ بغداد میں دریائے فرات کے قرب و جوار میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے لشکر مسلسل دو ماہ تک صلح کی کوششیں کرتے رہے مگر بعض دشمنانِ اسلام نے رات کی تاریکی میں بیک وقت دونوں لشکروں پر حملہ کیا تاکہ ہر فریق یہ خیال کرے کہ دوسرے فریق نے بدعہدی کی اور اس طرح یہ پتہ نہ چل سکا کہ کس نے کس کو قتل کر دیا ——— اس معرکہ کے بعد بھی چونکہ اجل صحابہ کے دل ایک دوسرے سے صاف تھے اس لئے معاہدہ' حضرت عمرو بن العاصؓ کی تجویز پر ہو گیا ——— اس قسم کی روایات سے یہ بات بالکل روشن ہے کہ اگر تاریخ کا بغور تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو بنو امیہ کے خلاف جو تاثر قائم کر دیا گیا ہے اور حضرت علیؓ کی جو سیرت سامنے آتی ہے اس میں نمایاں مثبت فرق پیدا ہو جائے۔

حضرت علیؓ ۲۱ رمضان ۴۰ھ کو شہید ہوئے، آپ کی مدت خلافت چار سال اور نو ماہ ہے، آپ کے بعد چھ ماہ تک اہل مدینہ کی رائے سے حضرت حسنؓ خلیفہ رہے مگر بعد میں آپ حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں جیسا کہ اوپر حوالہ دیا گیا، صاحبِ مضمون نے لکھا ہے کہ "حضرت عمرؓ کی شہادت کے تھوڑا عرصہ بعد امیر معاویہ نے خلافت کو سلطنت میں بدل دیا" ——— یہ وہی حضرت امیر معاویہؓ ہیں جن کا شمار جیّد صحابہ کرام اور کاتبانِ وحی میں ہوتا ہے مگر مصنف نے ان کے نام کے اوپر (رضؓ) لکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی ہے جب کہ صحابہ کرام کے ناموں کے ساتھ مسلمانوں کا وطیرہ چلا آرہا ہے کہ وہ سورۂ مائدہ کی ۱۱۹ ویں آیت کا ٹکڑا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط یعنی "خدا ان سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں" کی نشانی (رضؓ) بنا دیتے ہیں۔ اس موقع پر صاحبِ مضمون سے کوئی شکایت نہیں مگر اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آتی ہے۔

آپؓ ابوسفیان بن حرب کے بیٹے تھے، ہجرت سے ۱۷ سال قبل پیدا ہوئے، پانچویں پشت میں شجرۂ نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ بنوامیہ کے پہلے خلیفہ ہیں اور آپ کا دورِ خلافت ۴۱ ہجری سے ۵۹ ہجری تک پھیلا ہوا ہے۔ ۴۴ھ میں آپ ہی کے دور میں خیبر کی راہ سے ہندوستان پر حملہ ہوا اور قندھار فتح ہوا۔ ترکستان میں رامتنی، بیکنید اور نصف فتح ہوئے آپ ہی کے عہد میں بخارا فتح ہوا۔

حضرت امیر معاویہؓ کے سلسلے میں محولہ بالا ذہنی کیفیت کی چند وجوہات بیان کی جاتی ہیں جو کچھ اس طرح ہیں:

ا۔ آپ نے اپنے بیٹے کو ولی عہد نامزد کر کے شخصی حکومت کی داغ بیل ڈالدی۔

ب۔ آپ کے بعد حکومت بنوامیہ میں رہی جو اسلامی مزاج کے یکسر خلاف ہے۔

ج۔ خلافت و حکومت ایک عظیم الشان موروثی سلطنت میں تبدیل ہو گئی جو عربی و اسلامی سادگی کے خلاف ہے۔

درج بالا کے علاوہ دیگر وجوہات بھی بیان کی جاتی ہوں گی مگر عام طور پر اہم وجوہات میں سے یہی تین نمایاں ہیں ——— جہاں تک بیٹے کو ولی عہد سلطنت یا خلافت کے لئے نامزد کرنے کا تعلق ہے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ آپ نے بیٹے کو نامزد نہیں کیا بلکہ خلافت کی بیعت کے لئے پیش کیا تھا، ولایت عہد کی یہ تحریک ۵۰ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفیؓ نے پیش کی تھی اور یہ وہ موقع تھا جب قسطنطنیہ کے معرکۂ جہاد میں اسلامی لشکر کے کمانڈر کی حیثیت سے یزید بن معاویہ کی انتظامی قابلیت، حربی صلاحیت اور شجاعت و بسالت کے اعزاز میں ملت نے اس غازی کو "فتی العرب" یعنی عرب کے سورما کے خطاب سے نوازا تھا۔ یزید کی کمانداری میں جن جیّد صحابہ نے اس معرکہ میں حصّہ لیا اُن میں حضرات ابوایوب انصاریؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور حسینؓ بن علیؓ بھی شامل تھے، یہاں اس نکتہ کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اگر یزید بن معاویہؓ کی سیرت وہ ہوتی جیسی کچھ بیان کی جاتی ہے تو یہ جیّد صحابہ کرام اس کی سرکردگی میں کیونکر شاملِ جہاد ہوتے؟ ——— اسی ولایتِ عہد کی

تجویز کے زمانے میں پانچ امہات المومنین بقیدِ حیات تھیں یعنی حضرت حفصہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ جنہوں نے اس تحریک کی کوئی مخالفت نہ کی۔ اس کے علاوہ اسی دور میں اصحابِ عشرہ مبشرہ میں سے حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ ابھی زندہ تھے۔ اصحاب بدر میں سے ۱۸ صحابہ کرام، اصحاب بیعتِ رضوان میں سے ۱۴ صحابہ کرام اور دیگر صحابہ میں سے ۲۳۸ نفوسِ قدسیہ ابھی زندہ موجود تھے۔ اگر یزید بن معاویہ اس تجویز کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے تو ان اکابر صحابہ کرام کی سیرت و کردار سے بات بعید ہے کہ وہ خاموش رہتے اور بزور اس کی مخالفت نہ کرتے۔ مزید یہ بات بھی اسی تاریخ سے ثابت ہے کہ ان درج بالا صحابہ کرام میں سے تقریباً ۹۴ حضرات یزید کے عہد خلافت میں زندہ تھے ——— صاحبانِ فکر و نظر غور فرمائیں کہ ان صحابہ کرام کی کیسی سیرت تاریخ سے مترشح ہوتی ہے؟

جیسا کہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی باضابطہ تاریخ تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئی ہے اور یہ دور عباسی خلفاء کا دور تھا جنہوں نے خلافت کو بنو امیہ سے بزورِ شمشیر چھینا تھا، ان کے دور میں لکھی جانے والی تاریخ کا رویہ امویوں کے ساتھ اگر ایسا رہا تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو انگریزی دور کے مورخین نے "غدر" یعنی غداری سے تعبیر کیا اور اس لفظ کی اس قدر تکرار کی کہ خود مسلمانوں کی زبان پر آج تک یہ لفظ چڑھا ہوا ہے ——— اب پھر ہم اسی ولایتِ عہد کی تحریک کی طرف آتے ہیں، یقیناً باپ کا بیٹے کو ولایتِ عہد کے لئے پیش کرنا خلافتِ وقت کے لئے نئی بات تھی ——— مگر خلافتِ راشدہ کے ہر خلیفہ کے متمکن خلافت ہونے کا طریقہ کار جدا رہا ہے، اس سلسلے میں ابھی کوئی لگا بندھا طریقہ کار وضع نہ ہوا تھا جس کی پیروی کی جاتی، اصولی طور پر قرآنِ حکیم کے احکامات موجود تھے کہ امیر تقویٰ شعار اور برگزیدہ ہو، مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ باقاعدہ مختلف اصحاب کے درمیان خلیفہ منتخب ہوئے، حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے نامزد فرمایا اور لوگوں نے اتفاق کیا، حضرت عثمانؓ کا انتخاب ایک چھ رکنی کمیٹی نے کیا جسے حضرت عمرؓ نامزد کر گئے تھے اور حضرت علیؓ کے لئے مختلف الخیال آرا ہیں، حضرت حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کا معاملہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اب اگر حضرت امیر معاویہؓ نے خلیفہ کے انتخاب میں کسی نئے طریقہ کار کی طرف پیش رفت کی تو یہ کس طرح جرم ٹھہر سکتا ہے جبکہ یہ مرحلہ صحابہ کرام کی ایک عظیم فوج ظفر موج کے سامنے طے پاتا ہے۔ ہمیں صحابہ کرام کے ساتھ اور ان کی نیتوں کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے کیونکہ اس بات کی گواہی خود اللہ تعالیٰ دے رہا ہے کہ وہ سب آپس میں شیر و شکر تھے اور اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے ——— حضرت امیر معاویہؓ نے ایک نیا طریقہ کار ضرور اختیار کیا تھا مگر آپ کا منشا کسی موروثی مملکت کے قائم کرنے کا نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اتفاقاً پھر خلافت بنو امیہ میں ہی رہی، مگر اس معاملے کا قصوروار حضرت امیر معاویہؓ کو ٹھہرانا زیادتی ہوگی، اور نیتوں کا بھید تو اللہ ہی جانتا ہے اس پر حکم لگانا ہمارا منصب نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت

امیر معاویہؓ اس الزام سے بھی قطعی بری ٹھہرتے ہیں کہ ان کے بعد خلافت و حکومت میں وہ سادگی نہ رہی جو عربوں اور مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جہاں تک حضرت امیر معاویہؓ کا تعلق ہے تو اگرچہ تاریخ نے ان کو "مسلمانوں کا پہلا بادشاہ" تک کہہ دیا ہے اور ان کے دَور کو عیش و عشرت کے دَور سے یاد کیا ہے لیکن حقیقت کبھی نہ کبھی عیاں ہو ہی جاتی ہے ــــ حضرت امیر معاویہؓ کے انتقال کے چالیس سال بعد عیسائی راہبوں کا ایک گروہ دمشق سے گزرا اور اس نے ان عمارات کو دیکھا جہاں حضرت امیر معاویہؓ رہتے تھے تو اس گروہ نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے کہ "اس کے فرش چوہوں کے بل بنانے کے لئے بہت خوب تھے اور اس کی چھت کبوتروں کے گھونسلوں کے لئے بہترین" ــــــــ یاد رہے کہ ابھی اموی دَور تھا مگر چونکہ یہ عمارتیں پختہ نہ ہوتی تھیں اس لئے صرف چالیس سال کے قلیل عرصے میں ان کی یہ حالت ہوگئی تھی، انہی عمارات کو ہماری تاریخی کتب نے "محلات" کے لفظ سے تعبیر کیا۔

طلوعِ اسلام میں کئی سال قبل علامہ تمنا عمادی مرحوم کا ایک طویل مقالہ کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "ایمان تاریخ پر ہونا چاہیئے یا قرآن پر" ــــــــ مسلمانوں کو یہی بات طے کرنی ہے، اس کے بعد ہی وہ اپنے تمام امور میں "ثنویت" کے گھناؤنے جرم سے نکل سکیں گے اور تب ہی ان کی توانائیاں ضائع ہونے سے بچ سکینگی!

طلوعِ اسلام: تاریخی واقعات مضمون نگار کا اپنا حاصل مطالعہ ہیں۔

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

دیکھنا۔ سُننا۔ سوچنا

(۱۱)

بلاتحقیق بات مت کرو لوگوں کی عام عادت ہے کہ کوئی بات کہیں سے اُڑتی ہوئی سُنی اور اُسے، بغیر تحقیق کئے آگے پھیلانا شروع کر دیا۔ قرآنِ کریم اس سے بڑی سختی سے روکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)

"جس بات کا تمہیں یقینی طور پر علم ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو

تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے خود اپنے کانوں سے ایسا سُنا تھا، کیا اپنی آنکھوں سے ایسا دیکھا تھا اور یہ بھی پوچھا جائے گا کہ تم نے سمجھ سوچ کر اس کی تحقیق کر لی تھی اور خود تمہارے اپنے دل نے تو اس کے اندر کچھ نہیں ملا دیا تھا۔"

ہر بات کو اچھی طرح سے سنو۔ ہر چیز کو اچھی طرح سے دیکھو۔ پھر جو کچھ سنو اور دیکھو اس پر خوب غور و

غور و فکر کرو فکر کرو۔ اپنی عقل سے کام لو اور اس کے بعد کسی نتیجے پر پہنچو۔

جو لوگ اپنی عقل و خرد سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کرکے دوسروں کے پیچھے چلتے رہتے ہیں، وہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ؗ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ؗ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ؕ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ؕ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷/۱۷۹)

"ان کے دل تو ہوتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہوتے ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہوتے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اس لئے کہ یہ عقل و خرد [illegible]

رہتے ہیں۔"

عقل کے اندھے

جو لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے قرآنِ کریم انہیں اندھا قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ لوگ کبھی ان کے برابر نہیں ہو سکتے جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں اور ہر کام سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ؕ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۝ (۶/۵۰)

"کیا اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر ہو سکتا ہے؟ کیا تم لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے؟"

جو بات سنو اس پر غور کرو۔ لیکن خواہ مخواہ

ٹوہ میں نہ رہو

دوسروں کی باتوں کی ٹوہ میں نہ لگے رہو۔ یہ بہت بڑی بری بات ہے۔

وَلَا تَجَسَّسُوا (۴۹/۱۲)

"لوگوں کی باتوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو"

سُنو اور عمل کرو جو بات سامنے آئے اس پر غور و فکر کرو۔ پھر ان میں سے اچھی باتوں پر عمل کرو۔ اچھی باتوں کا محض سُن چھوڑنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اصل فائدہ ان پر عمل کرنے سے ہوتا ہے۔ مومنوں کا طریقہ یہ ہے کہ

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (۲/۲۸۵)

"ہم نے سُنا اور اس کی اطاعت کی"

بُری بات سے دُور رہو اور جو بُری بات سنو اس سے دُور رہو۔

اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ..... ..... (۲۸/۵۵)

"جب کوئی لغو بات سُنیں تو اس سے دُور ہٹ جائیں"

BE NOT AFRAID OF GOING SLOW
AFRAID ONLY OF STANDING STILL

WHO DOES NOT HOPE TO WIN
HAS ALREADY LOST

طلوع اسلام لاہور

طلوع اسلام لاہور

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کا درسِ قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
۱۔ ایبٹ آباد	۵۹۵ کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	جمعۃ المبارک	۱۰ بجے صبح
۲۔ بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر مرضی پورہ گلی نمبر ۵۔ رابطہ فون: ۲۴۳۸	ہر ماہ پہلا تیسرا جمعہ	۹ بجے صبح
۳۔ پشاور	برمکان محترم عبدالرزاق نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ/جمعہ	۴ بجے شام
۴۔ پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	۴ بجے شام
۵۔ پیر محل	مکان نمبر ۱۴۰/۱۳۹۔ مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹ بجے صبح
۶۔ پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	۳ بجے سہ پہر
۷۔ جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد جی۔ ٹی روڈ	جمعہ المبارک	۶ بجے شام
۸۔ جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	۱۰ بجے صبح
۹۔ چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	۳ بجے بعد نمازِ جمعہ
۱۰۔ چک ۲۱۵ ای۔ بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	//	۸ بجے صبح
۱۱۔ حیدر آباد	گولڈن سینٹری، عثمان آباد	//	۱۰ بجے صبح
۱۲۔ رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق، مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰ بجے صبح
۱۳۔ سرگودھا	۶۰۔ اے سول لائنز ریلوے روڈ۔ رابطہ فون ۶۳۳۸۳	جمعۃ المبارک	۹ بجے صبح
۱۴۔ سیالکوٹ	محمد افضل خلجی، ایبٹ روڈ۔ رابطہ فون: ۸۷۶۵۸	پہلا اور دوسرا جمعہ	۱۰ بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
۱۵۔ فیصل آباد	۲۳۔ سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون۔ ۴۲۸۵۵	پہلا اور دوسرا جمعہ	۳۔ بجے سہ پہر
۱۶۔ فیصل آباد	ڈاکٹر طارق عزیز فاؤنڈیشن B/۸۲۵ سول کوارٹرز غلام محمد آباد۔ رابطہ فون: ۳۳۰۷۰ / ۶۸۰۸۲۵	//	۳۰۔۳ بجے شام
۱۷۔ کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ	جمعۃ المبارک	۴ بجے سہ پہر
۱۸۔ کراچی	سنووائٹ کمرشل کمپلیکس (فرسٹ فلور) شاہراہِ فیصل (نزد بلوچ کالونی سگنل) فون: ۵۷۲۲۵۱ - ۵۴۷۳۲۹	//	۳۰۔۹ بجے صبح
۱۹۔ کراچی	مکان ۱۶ گلشن مارکیٹ، C/۳۶ ایریا کورنگی ۵ رابطہ: محمد سرور، فون: ۳۱۲۶۳۱	//	۳۰۔۱۱ بجے صبح
۲۰۔ کراچی	مکان 85 - E قصبہ کالونی، نزد الفاروق پبلک سکول رابطہ: ڈاکٹر اسلم نوید	//	۳ بجے سہ پہر
۲۱۔ کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ ایاز حسین انصاری رابطہ فون: ۴۵۷۱۹۱۹	//	۱۰ بجے صبح
۲۲۔ کراچی	مکان ۱۲۰۶ گلی ۱۰ اے بی ۳۶، شریف کالونی۔ لانڈھی رابطہ: لطیف، فون: ۳۱۰۳۱۶	اتوار	۸ بجے شب
۲۳۔ کوہاٹ	برمکان شیر محمد، نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	۸ بجے صبح
۲۴۔ گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	//	بعد از نمازِ جمعہ
۲۵۔ گجرات	مرزا ہسپتال، کچہری روڈ	جمعرات	۲ بجے
۲۶۔ لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹ بجے
۲۷۔ لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	//	بعد نمازِ مغرب
۲۸۔ ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	//	۱۰ بجے صبح
۲۹۔ جوہر آباد	برمکان حکیم فاروق شاہ قاضی کالونی	//	بعد نمازِ جمعہ
۳۰۔ ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک ۵۰۹ گ ب	//	//
۳۱۔ ڈی جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج، بلاک ۲۔ کچہری روڈ	//	۳ بجے
۳۲۔ راولپنڈی	برمکان ملک فضل کریم ۳۰ ملت کالونی ڈھوک سیداں ٹینکی رابطہ: چوہدری نثار احمد ہائی وے آٹو گوال منڈی فون ۴۷۵۲	//	۳۰۔۳ بجے شام

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Ghulam Ahmed Parwez (r)

NO RESERVATION REQUIRED

ALL THOSE INTERESTED IN THE TEACHINGS OF QURAN ARE CORDIALLY INVITED.

1. BIRMINGHAM 229 Alum Rock Road	Sunday 3 PM
2. CANADA 716 The West Mall, Etobicock, ONT Phone (416)245-5322 or(416)620-4471	1st Sunday 11 AM
3. DENMARK R.O.Aegte Taepper, Falkoner Aue 79 2000 Fredriksberg C.	Last Sat **2 PM**
4. KUWAIT Residence Ubaid-Ur-Rahman Arain Phone 5316273	Friday 5PM
5. LONDON 76 Park Road Ilford Essex Phone 081-553-1896	1st Sunday 2.30 PM
6. NORWAY Akeberg Veien-56 -Oslo-6 Galgeberg 4th floor	1st Sunday 4PM
7. YARDLEY 633 Church Road, Yardley, Birmingham B33 8HA (Phone 021-628-3718)	Last Sun 2PM.
8. ESSEX 50 Arlington Road Southend-on-Sea ESSEX SS2 4UW Phone 0702-618819	2nd Sun 3 PM
9. YORKSHIRE Cardigan Community Centre 145-49 Cardigan Road LEEDS-6 Contact M.Afzal 0532-306140 Contact Rashid Butt 0274-664620	1st Sun 3 PM

TOLU-E-ISLAM MAGAZINE AND PUBLICATIONS OF ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ(r) ARE ALSO AVAILABLE AT THE ABOVE PLACES

کہتی ہے خلقِ خدا غائبانہ کیا

The Toronto Sun, Thursday May 13, 1993

Pakistan's a shabby disgrace

Eric MARGOLIS

One of life's more painful moments is watching people you like make absolute ninnies of themselves.

This has been the case, lately, of Pakistan. The disgraceful antics of its politicians are making it look like some African coconut republic.

As I write, I'm looking at a photo of myself with Nawaz Sharif. I visited with him in his home in Lahore last year when he was prime minister.

Sharif, a former businessman, may not have been a great leader, but he was a moderately competent prime minister — and one who was trying to de-socialize Pakistan's wobbly economy.

On April 18, Pakistan's powerful and mysterious president, Ghulam Ishaq Khan, abruptly fired Sharif. Senior bureaucrat Ishaq Khan became president after the still unsolved assassination of President Zia ul-Haq in 1988.

Ishaq Khan claimed he had fired Sharif for allowing corruption to flourish. Every Pakistani government has been swamped by corruption.

The real reason was Sharif's poorly organized attempt to oust the president from office.

There was also a second, hidden reason. Sharif had appointed as head of Pakistan's crack intelligence agency, ISI, a forceful and highly capable officer, Lt. Gen. Javed Nasir. Ishaq Khan bitterly objected and wanted to name his own man.

Next, lovely Benazir Bhutto. Ishaq Khan had fired her when she was prime minister back in 1990. The president also arranged to have Benazir's husband, Asif Zadari, hit with a torrent of criminal charges and thrown into jail. Courts subsequently acquitted Zadari of most of the charges.

If you think all this is complicated, wait. On my most recent trip to Pakistan, last April-May, I met the powerful chief of staff of the armed forces, Gen. Asif Nawaz (no relation to Nawaz Sharif).

The chief of staff, president and prime minister are the three pillars of power in Pakistan. I remember thinking to myself, "Look how fit this fiftyish man looks — lean, mean and trim. Why don't you look like that?'

Eight months later, the fit Gen. Nawaz abruptly dropped dead of a heart attack after his morning jog.

Recently, his widow charged that the general was poisoned on the orders of President Ishaq Khan. She has not offered any proof, but Pakistanis, who thrive on malicious gossip and wild speculation, eagerly swallowed the widow's tale.

The wily president's next move was to name an interim prime minister — the resoundingly named Balkh Sher Mazari.

He is a feudal landlord from a conservative party run by one of Pakistan's more eccentric and exotic political figures, the Pir of Pagaro. Pir's are hereditary saints. There aren't supposed to be professional saints in Islam — but never mind.

New elections will be held using the Bhutto political machine to beat off angry backers of the ousted Nawaz Sharif.

Cynicism and duplicity that would make Machiavelli blush, naked opportunism, utter selfishness, staggering moral and political dishonesty. Ferocious greed. These are the hallmarks of Pakistan's miserable politics.

Founded as a beacon for the world's oppressed Muslims, Pakistan has turned into a black hole of corruption and chicanery. Shame on its politicians, one and all.

They have managed the astounding feat of making India's rotten political system look good by comparison.

Pakistan's politicians don't give a damn about their people or country.

Only the military has retained its honor. Lots of fed-up Pakistanis would like to see the soldiers take power.

سوچو کہ وقت جا رہا ہے۔

(ادارہ)

First, we shall ask the United Nations that its Protection Forces be replaced immediately by forces from Pakistan, Japan, Nepal, Irna, Turkey and Libya under Pakistani command.

All communication routes, including forest and other secret reoutes, between Serb held territories and Russia, Serbia and all non-Muslim countries should be sealed off and placed under armed troops from countries willing to sacrifice their soldiers in this noble cause.

Russia must be told to keep out of this war and must take back from the Serbs all the weaponry it has supplied them.

But neither the United Nations nor the Russians are likely to oblige. We shall have to take the initiative on our own. We repudiate the arms embargo and we refuse to contain the war within Bosnia Herzegovina. The war, we repeat, is not a civil war but one intiated and conducted by Serbia.

****

WHAT IS A HINDU

When we take over the Government of India and become powerful, we are going to subject Muslims of India to the following conditions:-

1. Do NOT believe that the Quran is Divinely revealed.
2. Do NOT believe Muhammad to be the Messenger of God.
3. Do NOT have any connection with Makkah.
4. Instead of Sa'di and Rumi, read Kabir and Tulsi Das.
5. Instead of Islamic festivals, celebrate Hindu festivals.

[Swami Seth Dev, as reported in "WAKEEL" Amritsar, 9 Dec. 1925]

AND THIS IS EXACTLY WHAT THEY ARE DOING.

The self-styled peace-makers enforced an arms embargo against the Muslims without first enforcing an effective arms embargo against the Serbs. Only after an effective arms embargo against the Serbs, should the embargo against the Muslims have been imposed, and then, too, only after the aggressor was made to yield all the territory taken by force, payment of sufficient damages and guarantees against any repetition of another aggression.

The arms embargo alone exposes the hypocrisy of the western nations led by Britain, as always they are.

We have to face the facts as facts.

It is necessary that Muslims, specially Muslim minorities, must at all times keep themselves armed to the teeth with the most sophisticated of up to date weapons. Muslim nations should keep in their arsenals, a surplus of such weapons for despatch to Muslims who need them. Delivery means should be kept in readiness all the time.

If the Muslim nations cannot unite because of individual ambitions or interests, they should, at least, act in unison where such interests are not involved, as in the present Bosnia conflict or where Muslim minorities are under pressure in any part of the world.

The execution of this programme will require a permanent secretariat located in the least vulnerable of places. Its functions will be, briefly stated, to

(a). maintain a survey record of the needs of Muslim countries;

(b) assess without delay their requirements in emergencies

(c) render prompt delivery of assistance without red-tape delays.

(d) establish a psychiatry cell to complete the studies.

(e) Maintain a mujahideen corps of, at least, half a million fully trained in the use of modern weapons, etc.,.

Of course, all this will have to be done in utmost secrecy.

Today we cannot bring the dead back to life, nor can we comfort the women in their sense of shame and anguish. All we can try to do is that there shall be no surrender to the aggressor, and no reward for aggression.

But HOW?

ONE, that humanity is not yet civilized enough to fight for a people other than one's own. The only example we come across in history is that of the prophets and their immediate followers who marched out with no motive other than to liberate the down-trodden, the persecuted, whatever their creed or race.

TWO, that religion is still an issue of sorts even among civilized nations.

Though people generally have no religion in them to live by, yet, when it comes to grouping up under a religion-banner, they suddenly wake up to a religious identity.

Half a century of Marxism has failed to drive out the urge for religion from the hearts of the peoples of occupied Europe. Christians now could openly profess Christianity, and Muslims their Islam. But the religion that has come to the surface is the spurious stuff. It is a pity that, instead of building up on the regained spiritual territory, one of them has taken to fighting the other with the avowed objective of eliminating those who do not belong to his own banner of race or faith. And the greater sorrow is that the aggressor has branded the war as one of religion, a crusade! This, however, is sheer hypocrisy. The war is one of expansionism, and has nothing to do with religion.

And it is not a civil war either but one initiated by another state, namely Serbia, ruled by Slobodan Milocevic a man no less ambitious and no less ruthless than Adolph Hitler or Mussolini. Dr. Radovan Karadzic is the Quisling of Bosnia-Herzigovina, a traitor to his own country, who takes orders from Belgrade.

THREE, that war can flare up anywhere on any pretext.

FOUR, that for some reason or another, Muslims everywhere seem to have become the favourite target of aggression plus persecution.

FIVE, There is always present an element of chauvinism.

NATO nations have refused and continue to refuse lifting the arms embargo against Bosnia because they do not like the idea of Muslims defeating any European community. They want minimum casualties among the Serbs and the maximum amongst the Muslims. To them, a first class European, a thorough bred European must be a Christian; therefore, European

Muslims are second class Europeans. In any case, Muslims have no right to be in Europe at all! Such appears to be their thinking.

LESSONS FROM BOSNIA

---SHAKIR RIZWANI

THE CURTAIN ON Bosnia is not down, as the powers that have whiled away the months sitting in their cosy discussion chairs in London, Paris or Washington, hopefully think. Until yesterday denouncing the aggressor and his atrocities they have suddenly decided to condone his multitude of crimes, and permit him to keep what he has taken by plunder.

The drama will long be recalled to the reluctant heart not only for its vicious excesses but more so for the willful devilry of the Europeans and Americans ---not the people, but their governments--- as seen in the arms embargo preventing weapons of self defence from reaching the defenders, thereby aiding and abetting the aggressor in his wanton aggression.

It is like tying the hands of a reigning champion of the boxing ring behind his back and then asking him to defend his title against a challenger!

The attitude of the public has consistently been at variance with the politics of their respective governments. Had it been a normal war, international or civil, the sympathies of the world would not have swung so sharply in favour of the Muslims. What marks the Serb aggression as abnormal is the total willful savagery, the planned torture, the gang rapes, the gangster type stabbing of civilians walking peacefully on the road, the slaying of babies and children, the burning alive hundreds in locked rooms, the tiered cages and the unmentionable filth of them, the inhuman bestialities, all so much in a category by themselves that I can describe them by no familiar word or phrase but only as "serbarities."

In the face of all this, the western governments have done nothing but shed crocodile tears.

American Secretary of State, Warren Christopher, has belatedly confessed, "We simply do not have the leverage; we don't have the influence, the inclination to use military force. We don't have the money to bring positive results soon." (Pakistan Times 7 June 1993).

Surely, the war, read together with the attitude of the world at large, ---the western nations, that is,-- has lessons that the developing nations, in particular, the Muslim, will do well to take to heart.

verse 4:59, because of incorrect interpretation, became the cause of sectarian differences among the 'Ummah'. The Ulema made the Holy Quran subservient to their thinking and beliefs instead of moulding their thoughts and beliefs according to the dictates of the Quran. In the words of the Quran they had made the Quran "Mahjur' - 25:30. Since they (Ulema) did not caption their decisions as their own but as the verdicts of "Quran and Sunnah", nobody had the guts to question them. And they were fully supported by the masses who were ever ready to lay down their lives in the name of "Quran and Sunnah". In this way came into existence a theocracy the like of which has never been seen anywhere else.

History stands witness to the fact that these Ulema (religious leaders) have not allowed any govt. to work in peace. As long as a Govt worked in collusion with them every decision was proclaimed as according to "Quran and Sunnah" whenever a Govt differed with them, they made the masses rise against them in the name of "Quran and Sunnah". This is what has been happening till this day and this is where the ulemas differed with Allama Parvez, for he was amongst those who translated the term "Allah & Rasool" as the "Central Authority" of a real Islamic State. This obviously did not suit the Ulemas who have posed themselves as being the sole custodians of Islam.

BY TRANSLATION A TRANSLATOR BRINGS QURAN TO THE LEVEL OF HIS OWN MIND

ALLAH GIVES AND FORGIVES MAN GETS AND FORGETS

yourselves, refer it to Allah and His Rasool." (4:59). It is quite obvious that the term "Allah and His Rasool" means the Central Authority of the Islamic State. The decision of the Central Authority would be final being strictly in accordance with the Divine Law.

5. Allah, the Almighty has promised at various places in the Holy Quran of the triumph and establishment of Allah's Deen by His Party - 58:22, and this has been referred to as the triumph of "Allah and His Rasool" (58:21) -

> "It is I and my Rasool (Apostle) who must prevail."

Obviously this triumph refers to the triumph of the Islamic State, otherwise the Power of Allah is all prevailing and ever previling.

6. The wealth of the Islamic State from the 'spoils of war, has been referred to in the Quran as "being at the disposal of Allah and His Rasool. (8:1). About the disposal of the spoils of war (booty) the Quran ordains to set aside 1/5 of it for "Allah and His Rasool" (8:41), obviously this amount would be spent for running the affairs of the state.

It is evident from these examples (from the Quran) that the term "Allah and His Rasool" clearly refers to the Central Authority of a truly Islamic State, where obedience to this authority would tantmount to obedience to Allah on whose behalf they function as His Agents. This continued to be the accepted interpretation of the terminology "Allah and His Rasool" as long as the system of Govt. remained truly Islamic. Later when the system was replaced by hereditory Kingship, the "Religous Leadership - Priesthood" made a complete mess of this interpretation.

WHAT HAPPENED AFTERWORDS

In the system of Kingship the affairs of the 'Ummah' (Muslim Nation) came to be divided into almost watertight compartments. The affairs temporal (worldly) remained in the custody of the Govt (Kings) while the affairs ecctesiastic (religious) were entrusted entirely to the so called 'Ulema" (religious leadership). *Under this duality of System the term "Obey Allah and His Rasool" come to mean obedience to two seperate authorities, i.e., Obedience to Allah and Obedience to Rasool (Apostle) (PBUH).* Obeying Allah was simple enough. You had only to refer to the Quran. But how was one to obey the Rasool (PBUH). To solve this problem the Prophet's Traditions (Ahidth) had to be collected and comiled. In this way the term "Quran and Sunnah" came into existence. And thus the final authority in religion fell into the hands of the 'Ulema' (Religious Leaders).

Under this arrangement the verse 4:59 was interpreted in this way:- "Obey Allah and Obey His Rasool and those placed in authority.... and if ye differ in anything amongst youselves.....", then, turn to the Ulema (not to the Central Authority) who will tell you what the Quran and Sunnah" say in the matter -- the verdict of the 'Ulema' would be final for the Govt as well as for the people!

Have you considered how the most trust worthy hand - hold (2:256) of the

personal life. But Islam is a 'Deen', a collective system of life encompassing the entire society, in fact all humanity - (3:102). Therefore the complete Observance of Allah's dictates as contained in His Book can only be brought about by the establishment of a full-fledged system of life or all. The state in which such a system is established would be known as an Islamic State, which of course has to be an independent state. The practical shape of obedience of Allah would be being a loyal citizen of a state based on the dictates, principles and values contained in the Quran.

The first State of this kind was stablished by the Holy Prophet (PBUH) imself in Madina. And he was the Central uthority of that State. On this basis ubservience to the Central Authority was in act subservience to Allah - (4 : 80) for hich the terminology used in the Quran is Obey Allah and His Rasool", the practical eaning of which is subservience to Allah's ystem of administration, established for the rst time in the world by Allah's 'Rasool' PBUH). Since this system was required to e continued beyond the life of the Prophet PBUH) (3:143), therefore, the practical eaning of the terminology "Obey 'Allah d His Rasool" was obeying this system.

BEDIENCE OF ALLAH AND HIS ASOOL'.

Many instances can be quoted from the uran to indicate that the term "Allah and is Rasool" refers in fact to the Centr al uthority or the Chief Executive of an lamic State. Let us, however, confine urselves to only a few examples:-

1- When due to confusion during the Battle of Uhad, the Prophet (PBUH) found himself isolated, he called aloud to the believers. On hearing his call all of them gathered around him. Since this call emanated from the Head of the Islamic State, the Quran mentions it as the call of "Allah and the Rasool. (3:171)

2. When the Jews broke their co venant with the Prophet (PBUH) in Madina, the Quran terms it "They actively resisted Allah and His Rasool"- (59:4).

3. People rising in rebellion against the Islamic state and causing mischief in the land are referred to in the Quran as "having declared war against Allah and His Rasool"- (5:33)

> In sura-e-Ahzab it is stated, "Those who cause hurt and injury to Allah and His Rasool, Allah has cursed them in this world and in the Hereafter, and has prepared for them a humiliating punishment"-(33:57).

Causing hurt and injury to the Prophet (PBUH) was understandable as he was after all a man who could be hurt by other men. But the expression "Causing injury to Allah" is beyond comprehension as none has power to do that. Obviously the terminology "Allah and His Rasool" refers to Allah's Deen, that is the system of life adopted in an Islamic State. [See also 9:1, 3&7].

4. It is stated in Sura Al-Nisa "O, Ye, who believe, Obey Allah and His Rasool" and those placed in authority amongst you", and further "If ye differ in anything among

In the name of Allah, the Rehman, the Raheem

THE QURANIC TERMINOLOGY "OBEY ALLAH AND HIS RASOOL (APOSTLE)".

by

Brig. (Retd) Izaz D.A. Khan

Note: Recently I heard from one Mr. Hussan Mujtaba, a medical student at Kings College, London, who was "extremely interested in Allama Perwez's exposition of the Quranic Phrase اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ "Obey Allah And His Rasool (Apostle)" and its ramification in the present day Muslim World. He has asked me to explain this term and unfold as to why it was a point of contradiction between Allama Parwez and the Islamic Orthodoxy. I have tried to do that in the ensuing paras which may also interest other readers of the "Tolu-e-Islam". (Author)

PREAMBLE

The basic teaching of the Holy Quran is that sovereignty belongs to Allah and Allah alone. This is the very crux of Allah's Deen and primary object of its establishment. This is what is meant by Unity or One-ness of Allah, which is the very essence of our belief. The political system laid down by the Qauran is based on this very Reality. It is only by keeping this great Reality constantly in view that the Quranic terminology "Obey Allah and His Rasool (Apostle)" can be properly understood and satisfactorily explained.

POLITICAL SYSTEM OF THE QURAN

Allah is the Absolute, the Transcendental Being, beyond even the farthest bounds of our imagination. How are we to obey Him then when we cannot see Him or contact Him or even visualise Him. Allah has been gracious enough to answer this great question Himself.

> "We have sent down to thee the Book in Truth that ye might establish the rule between men, as guided by Allah" (4:105).

> And, "Follow not friends and protactors other than Him (7:3)

And at yet another place.

> "Those who dod not establish a Government according to what Allah has revealed, they are non-believers" (5:44).

Had Islam been a religion like other religions, each individual could easily have followed the dictates of God in his/her

Qur'an Law."

(Ahkamul Qur'an lil Hasas Tafhimul Qur'an)

"When Maiz Bin Malik Aslami committed the act of zina, Hazzal bin Naeem, advised him to go and confess his crime before the Nabi (Peace be upon him). He did go. The Nabi (Peace be upon him) gave him the punishment of stoning on the one hand and on the other hand told Hazzal that it was better for him to keep it secret."

(Abu Dawood - Tafheem)

(Note - The punishment of stoning is no where to be found in the Qur'an)

"Excause each other in matters of 'HADOOD' but when the matter reaches me, punishment shall be carried out necessarily" (ABU DAOOD & NISAI-TAFHEEM)

The above said Anadis point towards keeping the affair secret, but for punishment after it is disclosed. They also point towards giving due consideration to the life of the unborn.

THIS ARTICLE WILL CONTINUE IN THE NEXT ISSUE TO INCLUDE

* RAPE AND PREGNANCY
* VIEWS OF MUSLIM JURISTS ON ABORTION
* PHILOSOPHY OF CRIME AND PUNISHMENT
* THE QURANIC LAWS FOR MURDER
* ISLAMIC SOCIAL ORDER A BEAUTIFUL BLEND OF PERMANENCE AND CHANGE
* ABORTION IN LITERATURE OF RENOUNED MUSLIM PHYSICIANS OF THE PAST

question is rather difficult, Yet a law is after all a law. It can not be changed or modified for individual cases. A person living in an Islamic State shall have to be punished according to law. However, for those Muslims who originally belong to an Islamic State but are living temporarily in an un-Islamic Country in order to earn their livelihood, the case is different. Such persons are bound to obey the law of the country in which they live. They might be able to escape the penalty for abortion prescribed by the Islamic law. Yet there is no way of escape for them; from the law of Requital prescribed by the Qur'an. However, let me quote certain Ahadis ~~respect~~ __

1. There came to the Rasool (peace be upon him) a woman from Ghamid and said, 'Allah's Rasool! I have committed adultery, so purify me." The Rasool (Peace be upon him) turned her away. On the following day she said, "Why do you turn me away? Perhaps you turned me away as you turned away Maiz. By Allah, I have become pregnant. The Rasool (Peace be upon him) said, "Well if you insist upon it, then go away until you give birth to the child. When she delivered, she came with the child (wrapped) in a rag and said, "Here is the child whom I have given birth." The Rasool (Peace be upon him) said, "Go away and suckle him until you wean him." Whan she had weaned her child, she came to the Rasool (Peace be upon him) with the child who was holding a peace of bread in his hand. She said, 'Allah's Rasool! here he is, I have weaned him and he eats food. The Rasool (Peace be upon him) entrusted the child to one of the Muslims and then pronounced punishment on the woman.

The above said Hadis indicates that the life of the unborn is given due considerations as the punishment was meted not only after the birth of the child. It also indicates that the people during the life time of the Rasool were aware of the accountability before Allah for their actions.

According to the Islamic Law, it is not essential that one who commits 'Zina' should voluntarily declare it, or those who are in the know of it, should necessarily inform the court about it. However, when the news reaches the court the punishment must be prescribed according to law".

(Abul Ala Maudoodi - Tafhimul Qur'an, Vol 3, page 332)

"Any body who passes, through these na sty affairs, shall keep himself/herself hidden behind the curtain on account of the fear of Allah, but if he discloses his/her secret, surely he shall be punished according to the

Consequently, the Qur'an, as the first step, puts up a formidable obstacle against illegitimate sex, so as to avoid abortions. Thus it is said:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۴/۲)

"The woman and the man guilty of adultery or fornication, flag each of them with a hundred stripes. Let not compassion more you in their case, in a matter prescribed by Allah, if you believe in Allah and the last day; and let a party of the believers witness their punishment."

On the other hand, as stated above, the Qur'an purifies the society from temptations which excite passion. Thus 'Fawahish' or all acts leading towards 'Zina' are strictly prohibited. Thus it is said:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝ (۴/۱۵)

"If any one of your women are guilty of lewdness (acts leading towards Zina), take the evidence of four (reliable) witnesses from amongst you against them; and if they testify, confine them to homes, until death do claim them, or Allah ordains for them some other way (e.g. she gets married if already unmarried).

It shows that punishment for adultery, fornication and acts leading towards 'Zina', if carried out strictly are the most dependable checks against committing this crime. But the question still remains to be answered as to what should be done if the crime has already been committed; and the woman has become pregnant? Killing a fetus amounts to murder; on the other hand leaving the fetus untouched brings shame and stigma for life, to the affected woman. Could a woman placed in this position be compelled to carry the pregnancy to term? Would it be morally sound for her to keep her seduction and abortion, a secret from her perspective husband?; because no husband would like to marry a woman carrying this stigma. Can abortion be allowed in an early stage, in such cases so as to save a young girl from premature parenthood and provide her an oppertunity to marry late?

It is rather difficult to answer these questions. The answer to this

insulted the wife of his neighbour. But if a man rapes a girl with whom he is betrothed, in a field or a lonely place, the man should be killed but not the girl. (ISTASNA 22-36).

But before Christ, the Jewish priests had abrogated these laws. The modern laws followed in the west, are more or less based upon the above-said concepts.

ISLAMIC LAW

As opposed to the above - said laws, the Islamic law considers 'Zina' itself an essential crime. The Islamic view looks at 'Zina', from the angle that freedom to commit 'Zina' strikes at the root of human civilisation. The Qur'an in order to protect the society from the dangers of 'Zina', not only depends upon lawful penalty but prescribes large scale protective and corrective measures to check 'Zina', even when the act is not wilful. To begin with, the Qur'an promotes the nourishment of human personality and inculcates in the minds of the people the perception of severe consequences, subject to the law of requital from which he shall not be exonerated even after death; this being the essential part of the Muslim belief. Again it repeatedly reminds the believers, that 'Zina' is one of the greatest crimes, for which man shall be questioned by Allah. On the other hand, the Qur'an provides all sorts of facilities for (نکاح) wedlock. Allows even more than one wife under the hazardous conditions that prevail after a war when there is a scarcity of male population. On the other hand, if a man and a woman fail to cooperate with one another, it allows the dissolation of marriage, divorce for men and 'Khula' for woman. Moreover, in cases of dispute between a husband and a wife, advises to hold a (پنچایت) court of elders for arbitration; which if not successful, further paves the way to approach the court of law, in order to bring about a compromise, or as an alternative, a complete separation from one another, when they are allowed to marry other persons of their choice. Even the consorts of Nabi (Peace be upon him) were ordained to stay quietly at their homes and not to make a dazzling display, like that of the former times of ignorance.

The Qur'anic law does not allow people to deal with the issue of 'Zina' personally. It is for the court to decide the case.

amongst the British women and even church going teen--agers reckon, it is O.K. to make love before marriage" Thus illegitimate sexual union, resulting in un-wanted pregnancies have become a routine of life in the west, and the remedy to safegaurd premature parenthood is abortion.

According to Bible, fornication is a simple 'fault from which man is exonerated after the payment of Dowry. If a man, after seduction, cohabits with an unmarried girl who is already betrothed, the offender should marry her after payment of dowry. And if the father of the girl does not agree to it then the offender should pay in cash the amount of (Mahr) dowry which in practice is paid to an unmarried girl (ch. 22, verse 16-17)

The above law is nearer to the Hindu concept on this issue. (Says - MANOO KI DHARM SHASTRI)

A man who commits wilful fornication with an unmarried girl, is not liable to punishment. He should marry her, if the father of the firl agrees; by payment of compensation. But if the girl belongs to the higher caste and the man is of a low caste, the girl shall be turned out of the house and the man shall be punished by amputatung his body parts. (ADHIAE - 8, ASHLOK 365-366)

As a matter of fact in these societies it is only the adultery which is considered a crime.

The Jewish Laws for adultery __

"If any one cohabits a woman who is a slave or a betrothed one who has neither been freed, nor her فدیہ has been paid, both the partners should be punished but not killed, because the woman was not free. " (AHBAR 19-20)

"Whosoever commits adultery (with the wife of a neighbour) both of them should be killed (AHBAR 10-20)

"If a man commits adultery, both of them should be killed." (ISTASNAD 22-23)

"If a man is caught committing adultery with a girl who is already betrothed, inside a city, both of them shall be brought at the gate of the city and stoned to death. The girl shall be killed because she did not cry, although she was inside the city and the man shall be killed because he

Such cases that fall under these three catagories may call for termination of pregnancy and it is a matter of utmost importance to make a decision as to whether abortion in such cases is justified.

Conditions regarding illegitimate relationship between a man and a woman differ widely amongst individual socities, especially those in the East and the West. In Islam, it is only the institution of marriage that legalises the sexual union while in the west premarital sex is the norm. A civilised community abhors against illegal sex relationship between a man and a woman. The existence of human race and human civilisation depends on its check against males and females separating from each other after satisfying their lust by sexual union. Rather it demands a mutual and a popular contract, between a man and a woman, approved by the society itself. Without it the very idea of a human community becomes null and void; because a human child needs the supervision and guidance of both his father and mother. A woman alone can not fulfil this requirement. Thus without the mutual contract of marriage human civilisation ceases to exist. The very birth of the institution of 'one home' and 'one family' and the development of relationship btween one family and the other, took place by the permanent living of a man and a woman, for the sake of upbringing their children. Without this basic factor the human civilisation could not take root. That is why the sexual relationship between a man nd a woman without any known and recognised contract, is against the human civilisation; and that is why sex without marriage is considered a hateful act by the society and a sin by religion, and that is why attempts have been made in successive ages in human history to recognise marriage as a solemn. act and adopt measures against illegitimate sex. However, some societies take it lightly and others more seriously.

Although all societies reject illegal sex the punishment prescribed by different people differ. This is the point at which the Islam adopts a different and specific attitude. In other societies fornication (sex by consent) is considered to be trivial incidence; and it is only the adultery (voluntary illegitimate sex between married persons) which alone is liable to punishment; and in adultery too, it is only the woman and not the man who is considered to be sinful.

A report published in Sunday Times Durban, May 1984, after a survey carried out among British women says: Virginity is right out of fashion

'RUH' appeared at the human stage only. But what is 'Ruh'? The Qur'an says: وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۱۷/۸۵)

"(O Muhammad!) They ask thee concerning 'Ruh'. Say, that the 'Ruh' comes from the command of thy 'Rabb' of its knowledge, it is only a little that is communicated to you."

However, the 'Ruh' or Divine Energy manifests itself in various ways in the universe as indicated by the holy Qur'an. In human beings it manifests itself in a specific form known as نفس 'Nafs' in the Quranic terminology. All actions dependent on the freedom of choice, and the will power, cast their image on 'Nafs' or human personality. The 'Nafs' presents itself in an undeveloped form and has got immense potentialities. It has got the capacity to develop on the blue-prints of the divine attributes. The potentialities become actualised by such human actions which are in conformity with the divine laws provided to mankind through the messengers of Allah. He who gradually develops his 'Nafs' draws closer to Allah, which means that he realises and manifests Divine attributes within himself. The more the human 'Nafs' is developed, the more it is capable of survival and fit for passing on to its next higher stage of evolution, after physical death takes place. On the other hand, the one whose actions are in the opposite direction, causes to produce the disintegeration of 'Nafs' i.e. he recedes from the real and draws closer to the unreal. Thus it is abundantly clear that 'Ruh' or divine energy which manifests itself in the form of 'Nafs' in man, is related to wilful human actions and the wilful human actions do not start in the intra-uterine life of man.

(Please note that the issue of ensolement has been described in detail here, on account of its implications on the subject of abortion to be described in the next pages.)

After describing in detail the development stages of man in the intra-uterine life, we are now in a better position to discuss the subject of abortion.

UNWANTED PREGNANCIES

The unwanted pregnancies may be the result of (1) Illegitimate sex, by mutual consent of a male and a female (2) Or it may the result of Rape. (3) And thirdly there are pregnancies which result in deformed fetuses.

The scientific observations, by means of microscope. as well as by naked eye, indicate that the timings and the content's of the fetal development described in the above said Ahadis are inaccurate, vague and fictitions. These are based on concocted heresy. These can in no way be the sayings of the Rasool (Peace be upon him) Moreover the subject of ' ' Fate (which is outside the scope of this work), is an open antagonist to the Law of Requital prescribed by the holy Qur'an.

ENSOLEMENT OF THE FETUS.

The issue of ensolement of the fetus as laid down in the above Ahadis and by the Muslim Jurists, needs clarification __ It appears that our Jurists and the so-called religious scholars consider the 'Ruh' (روح) and the life ( ) as one and the same thing No body can question the fact that anything which possesses the basic properties of Nutrition, Respiration, growth, development. self repair, Reproduction and Adaptation, is a living object. All animals and plants possess life, yet — they do not possess 'Ruh', with the only exception of man. The holy Qur'an has made it abundantly clear when it is said:-

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝
ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ
فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا
مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

"One Who made everything that He has created in an appropriate form and initiated the creation of man from the inorganic matter of the earth and made *his* progeny from an extract (of what may seem to you) a despised fluid. Then He fashioned *him* in proper form and breathed into *him* his 'Ruh' and invested *you* with faculties of hearing, seeing and mind. But very few of you make the right use of these faculties."

It is obvious that in the above said verses, the two preliminary stages __ the stage of creation of life in the inorganic matter and the stage of Sexual Reproduction — which are the earlier evolutionary stages before man came into being, are described in the third person نَسْلَهٗ، سَوّٰىهُ، فِيْهِ But the stage at which the senses of sight hearing and MIND appeared, with the manifestation of freedom of choice and will-power, the holy Qur'an addresses man in the form of seemed person. لَكُمْ It clearly indicates that although life was and is present in creatures who appeared before man, but

perverted issue which needs clarification and we shall discuss it soon.

FETUS AND THE AHADIS LITERATURE. (as laid down in Sahih Muslim Sharif - Kitab-al-Taqdeer).

1. Abdullah (may Allah be pleased with him) relates "Rasool (Peace be upon him) said, " Verily everybody amongst you remains in the mothers womb for 40 days. There after 40 days he changes in blood clot, then after another 40 days, it changes in to a piece of flesh. Then Allah sends a angel towards him who ensoles him. Then ordains four things.

a. His livlihood - whether he shall be rich or poor?

b. His age - as to how long he shall live.

c. His actions as to how he shall act during life on the earth.

d. Whether he shall be pious or wicked.

2. Abdulla bin Masood said,, "Wretchedness starts from the mother's womb. __ After Nutfa passes 40 nights in the mother's womb, Allah sends an angel who gives it a form, makes its eyes, ears, skin, flesh and bones. Then asks, O Allah! Is it a male or a female? Then he notes down what Allah orders. Then he asks, "O Allah! What about his livlihood?" Again he notes down what Allah orders. Then the angel comes out with a book which shall never undergo change.

3. Abu Sariha bin Sayed Ghaffar relates. I have heard Rasoolullah (Peace be upon him) saying, "that nutfa remains in the mother's womb for 40 nights. Then an angel descends on it who gives it form and asks, 'O Sustainer! Will it be a male or a female? After Allah's reply, he again asks, will it he complete or defective? Then the angel asks about his livlihood and then about his age."

Uns bin Malik relates __ The Rasool (Peace be upon him) said, "Allah appoints an angel inside the uterus, who proclaims, "O Allah it is a Nutfa Yet. (b) It is an Ala'qa Yet (c) It is a Muzgha Yet. And before Allah wants to give birth, the angel declares, "This is a man; This is a woman; this is good, this is bad, what shall be its, livlihood and what shall be the age. Everything is noted down withthin the mother's womb.

the verses (23: 12-14) as follows. وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝

"We created man from the extract of clay. (This is the evolutionary stage when life had not yet originated in the non-living matter." ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝

Then we placed him as a reproductive unit in a temporary abode (inside the uterus) to be firmly fixed". ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً

Then from the reproductive unit (نطفه امشاج) We created a hanging mass." فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا

Then we created inside the hanging mass a 'Muzgha'. Then we created the skeletal system inside the 'Muzgha'. Then we covered the body framework with muscles. فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ

Then we brought forward a new creation. "So blessed be Allah whose creation is most appropriate." فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝

It is worth remembering that in the 'Alaqa' stage it is too small a mass to be recognized, the blastocyst itself being a microscopic structure. Thus in cases of Abortion is only the fetal stage that is discussed.

FETUS AND THE MUSLIM JURISTS

We have described above the development stage of a fertilized ovum from the science as well as from the Quranic points of view respectively. Now let us see what the Muslim Jurists say about it.

1. One view stands for "What is inside the uterus". It is clear that this view is misleading because the term fetus stands only for a specific part of the intrauterine development stages and not for the whole of it.

2. The second view is of Imam-al-Shafi who holds that the stage, whereby that which is inside the uterus can be called a Fetus, is that when the stages of 'Alaqa' and 'Muzgha' have been differentiated and it can clearly be made out to be a human generation possessing such characteristics as fingers, nails or eyes or anything similar to that. This view is more or less correct.

3. The third view is that of Al-Nuwayri who says that the learned people use the word جنين (fetus) for that which (exists in the world) after the ensolement has taken place" This issue of ensolement of the fetus is a

mentioned changes from Zygote to the formation of blastocyste take place within the fallopian tube. Simultaneous within these changes the cellular mass is gradually carried along the fallopian tube by the action of citia. It takes about a week to reach uterus when the blastocyst carrying the 'Alaqa' gets deposited in its inner surface.

The above described changes occur in the outer cells of the Morula. Now we describe the changes in the inner cells which so far were in the stage of Alaqa. By further development the Muzgha forms within the 'Alaqa'. First the cells of Alaqa differentiate in to three different layers. in which by further development, tissues, organs and organ systems are formed. THREE weeks after fertilization the human embryo is about the size of a course grain of sand.

FOUR weeks after fertilization, the eyes are partly developed and the heart is already beating. In the Fifth week, limb buds appear. IN the 8th week human form is recognizable, from this stage onwards it is called Fetus when the embryo is one inch long. By the 12th week, the semicircular canals in the ears are functional and the fetus moves by its own accord within the Amniotic pool. Eyelids are still fused but the eyeballs may move underneath. Five months after fertilization, fetus is about 8 inch long and weighs about one Lb. and facial features show signs of individual personality and development of tissues and organs takes place simultaneously. The appearance of bony tissue, called عظٰمًا by the holy Quran which gets enclothed lay muscular tissue called لحمًا by the Qur'an, also take place.

It must be emphasized that there is no hard and fast line between one development stage and the other, described above each stage gradually merges in to the other.

It may also be pointed out that the non scientist commentators of the holy Quran have not been able to understand these development stages correctly. They interpret the word علقه as congealed blood, although the embryo at this stage is only mass of un differentiated cells, there being no blood in it. Moreover they interpret both the words 'Muzgha' and لحم Laham as گوشت flesh. As a matter of fact, in the مضغه Muzha stage the embryo looks like a chewed piece of flesh, in which bones have not yet been developed.

The holy Quran has beautifully described these development stage in

ABORTION

By

Dr. Syed Abdul Wadud

Abortion is the termination of pregnancy before full term. It may occur as the result of some physical injury or disease, or it may be deliberate through human intervention. In the later case it may be induced by means of drugs used by the pregnant woman herself, or by the aid of a medical practitioner who empties the uterus by various means available. However, ethics, law and religion are concerned with abortions that occur as the result of direct human intervention and not with cases of miscarriage.

The subject of abortion has not been unknown in the annals of history. Throughout the ages there have been societies which permitted it, while others prohibited it.

While discussing the subject of abortion, the main question that is required to be solved is whether the willful destruction of a fetus inside the mothers' uterus amounts to murder or not? Before doing so, we ought to have a clear picture of the various development stages that occur during pregnancy, because of the varied descriptions of these stages of development of a fertilized ovum. Presented by certain religious people A male sperm fertilizes an ovum (female egg) inside the fallopian tube of the mother. Although the sperm and the ovum, each one of them is a living cell, yet they do not form separate human entity before fertilization. After fertilization they form a Zygote, or نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ in the Quranic terminology. A Zygote is a starting point of a separate living organism. It begins to divide immediately after fertilization. The division and redivision occurs at a great speed until it forms a mass called morula. The morule soon comes to consist of two groups of cells. One group in the centre of the mass represents the embryo — proper which gives rise to future off-spring. Surrounding the central group are cells which do not form part of the off-spring body as such, instead they form the extra-embroyomic membranes. This stage where a cavity is formed within the morula is called a Blastocyst. The hanging mass inside the Blastocyst which forms the starting point of the future embryo is called by the Hody Qur'an as عَلَقَة . The above